سلسلہ پیسہ لائبریری نمبر ۷

ڈاکوؤں کی کہانیاں

مرتبہ

سیّد امتیاز علی تاج

سنہ ۱۹۳۹ء

دارالاشاعت پنجاب لاہور

قیمت ۸/

دیباچہ

یہ کتاب پیسہ لائبریری کے سلسلہ کی ساتویں کتاب ہے ۔

پیسہ لائبریری کا سلسلہ دو خیالوں سے شروع کیا گیا ہے۔ ایک تو اس خیال سے کہ لڑکوں کو اپنے سکول کی کتابوں کے علاوہ دوسری اعلیٰ کتابیں برابر ملتی رہیں۔ اور دوسرے اس خیال سے کہ انہیں اپنے جیب خرچ کا کچھ حصہ اپنے شوق کی کتابوں پر صرف کرنے کی عادت پڑے ۔

پہلی غرض کے لئے کوشش کی جائے گی۔ کہ اس سلسلہ کی ایک کتاب ہر مہینے چھاپی جائے۔ اور اس میں ایسی دلچسپ کہانیاں درج کی جائیں۔ جن کی زبان پُرلطف اور پیاری ہو۔ کہ بچے انہیں شوق سے پڑھیں۔ اور ان میں آگے چل کر اچھی کتابیں پڑھنے اور ان سے لطف اُٹھانے کا شوق پیدا ہو ۔

دُوسری غرض کے لئے ضروری ہے۔ کہ بچے ان کتابوں کو خریدنے کا بوجھ اپنے ماں باپ اور بزرگوں پر نہ ڈالیں۔ بلکہ جس طرح اپنے جیب خرچ کے پیسے مٹھائی۔ پھل اور دل بہلاؤ کی دوسری چیزوں پر خرچ کرتے ۔ اسی طرح کتابو[illegible] خرچ کریں ۔

[illegible] ایک پیسہ ہر روز بچا کر وہ اس سلسلہ کی ایک

نئی کتاب ہر مہینے حاصل کر سکتے ہیں۔ ایک پیسہ ہر روز بچانے سے مہینے
کے آخر میں ان کے پاس ۷.۰؍ جمع ہو جائیں گے۔ ان ساڑھے سات
آنوں کے وہ ڈاک کے ٹکٹ خرید لیں۔ ایک آنہ کا ٹکٹ لفافے پر لگا کر باقی
۶.۰؍ ہمیں بھیج دیں۔ ان ساڑھے چھ آنوں میں سے ۲.۰؍ تو یُوں خرچ ہوں
گے۔ کہ کتاب ٹکٹ لگا کر اور ڈاک خانے سے پوسٹل سرٹیفکیٹ لیکر انہیں
بھیجی جائے گی۔ باقی ۴؍ میں انہیں سَو صفحوں سے زیادہ کی کہانیوں کی ایک
خوبصورت کتاب دی جایا کرے گی ۔

ہمیں اُمید ہے۔ یہ سلسلہ لڑکوں اور لڑکیوں میں بے حد مقبول ہوگا۔
اس کے متعلق سب ضروری باتیں وہ دفتر اخبار پھول سے پمفلٹ "پیسہ لائبریری"
منگا کر معلوم کر سکتے ہیں ۔

بچّوں کے والدین اور اُستادوں کی فرمائش پر کتاب میں کہانیاں زیادہ
اور ان کا اندازِ بیان بمقابلہ پہلی کتابوں کے آسان کر دیا گیا ہے ۔

سیّد امتیاز علی تاجؔ

کہانیوں کی فہرست

حُسن بانو

(۱)

اُسنا ہے۔ کہ خراسان کے مُلک میں ایک
بادشاہ تھا۔ انصاف میں ایسا کہ شیر اور بکری
کو ایک گھاٹ پانی پلاتا تھا۔ اُس کے وقت
میں برزخ نام سوداگر بڑا مال دار تھا۔ اُس کے
گماشتے ہر مُلک میں سوداگری کے واسطے مقرّر
تھے۔ بادشاہ سے بھی اُس کا میل جول تھا۔
بادشاہ اُس پر بڑی مہربانی کیا کرتا تھا۔
ایک مُدت [illegible] کے بعد اس سوداگر کا آخری

وقت آن پہنچا۔ اُس کی تھی ایک بیٹی حُسن بانو۔ وہ اُس وقت بارہ ایک برس کی ہوگی۔ سوداگر نے اپنی بیٹی اور اپنا مال اسباب سب بادشاہ کے سپُرد کر دیا اور مرگیا۔

بادشاہ نے حُسن بانو کو اپنی بیٹیوں کی طرح پالا پوسا اور جوان کیا۔ جب وہ خُوب سمجھدار ہوگئی۔ تو اُس کے باپ کا تمام مال اسباب اس کے سپُرد کیا۔ اور کہا" بیٹی اب تم جوان ہوئیں۔ تمہارا مال اسباب مَیں نے تمہارے باپ کی حویلی میں پہنچا دِیا ہے۔ اب تم وہاں جاؤ۔ اور جس طرح دِل چاہے اپنا روپیہ پیسہ اٹھاؤ۔

(۲)

حُسن بانو اپنے باپ کی حویلی میں رہنے لگی۔ ایک دِن اپنے کوٹھے بیٹھی ہوئی بازار

تماشہ دیکھ رہی تھی۔ کہ ایک فقیر اُدھر سے گذرا۔ اُس کے ساتھ ساتھ چالیس نوکر تھے۔ فقیر زمین پر پاؤں نہ رکھتا تھا۔ جو نوکر ساتھ تھے۔ وہ سونے چاندی کی اینٹیں بچھاتے جاتے تھے۔ اور فقیر اُن اینٹوں پر پاؤں رکھتا ہوا چلا جارہا تھا۔ اِس حال میں حُسن بانو نے جو اُس کو آتے دیکھا۔ تو اپنی دائی سے کہا۔ "اے اماں جان یہ فقیر تو بڑا پہنچا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ جو اس ٹھاٹھ سے راستہ چلتا ہے۔"

دائی نے کہا۔ "اماں واری یہ بادشاہ کا پیر ہے۔ مہینہ میں دو چار بار بادشاہ اس کے ہاں جاتا ہے۔ اور دو چار بار یہ بادشاہ کے ہاں جاتا ہے۔ اس کے برابر دُنیا میں اب کوئی درویش نہ ہوگا۔"

حُسن بانو نے یہ بات سُن کر کہا۔ "تم اجازت

دو۔ تو مَیں اِس فقیر کو اپنے ہاں مہمان بلاؤں۔ اور اپنی آنکھیں اس کے پَیروں پر ملوں" دائی نے کہا "جانی تجھ کو مُبارک ہو۔ شوق سے بُلا لے"

حُسن بانو نے کسی شخص کے ہاتھ بُلاوا بھیجا۔ تو شاہ صاحب نے کہا "بڑوں کو چاہیئے۔ کہ چھوٹوں پر مہربانی کریں۔ آج تو مجھے کام ہے۔ کل صُبح مَیں آجاؤں گا"

حُسن بانو نے یہ جواب سُنا۔ تو طرح طرح کے کھانے پکوانے شروع کئے۔ کئی تھال میوے اور مٹھائی سے سجائے۔ کئی کشتیوں میں جواہرات سجا کر رکھے۔ کہ کل صُبح شاہ صاحب آئیں گے تو پیش کروں گی۔

(۳)

اگلے دِن شاہ صاحب نے چاندی کی

اینٹوں پر پاؤں رکھتے ہوئے حُسن بانو کے گھر پہنچے + ان شاہ صاحب کا حال میں تُم سے کیا بیان کروں۔ ظاہر میں تو بڑے نیک فقیر بنے ہوئے تھے۔ مگر اُن کا دِل شیطان سے بھی کالا تھا + حُسن بانو نے اُن کے لئے دروازے سے بیٹھک تک سُنہری کپڑے کا فرش بچھوا رکھا تھا۔ شاہ صاحب اس پر سے گذرتے ہوئے بیٹھک میں پہنچے۔ اور تکیہ سے لگ کر بیٹھ گئے +

نوکروں نے جواہرات کی کشتیاں پیش کیں۔ مگر اُس نے قبول نہ کیا۔ اور کہا "یہ میرے کِس کام کی ہیں" + پھر طرح طرح کی پوشاکیں پیش کیں۔ مگر اس نے اُن کو بھی پسند نہ کیا + آخر دستر خوان بچھا اس پر طرح طرح کے کھانے سونے چاندی کے باسنوں میں رکھے گئے + نوکر سونے کی چلمچی اور آفتابہ لائے۔ اور بولے "حضور۔ ہمارے

بی بی کو اُمیّد ہے۔ کہ آپ اُن کی خوشی کے لئے کھانا ضرور کھائیں گے"۔

شاہ جی نے کھانے سے انکار نہ کیا۔ ہاتھ دھو کھانے لگے۔ پر جی میں کہتے جاتے تھے۔ کہ برزخ سوداگر بڑا مال اسباب چھوڑ کر مرا ہے۔ آج کی رات کسی طرح اس سب اسباب کو اپنے گھر لے جانا چاہیئے۔

اسی سوچ میں بہت کم کھانا کھایا گیا۔ اتنے میں نوکر عطر دان لے آئے۔ اُس نے عطر اپنی داڑھی اور پوشاک میں ملا۔ گھر کے قیمتی سامان کو بھانپا۔ اور دُعائیں دیتا ہُوا رُخصت ہو گیا۔

(۴)

اس روز نوکر ضیافت سے بہت تھکے ہوئے تھے۔ رات ہوتے ہی پاؤں پھیلا کر سو گئے۔ نہ اُنھوں نے کوٹھوں کو بند کیا۔ نہ اسباب کو ٹھکانے

سے رکھا ۔

پہر رات گئی ہو گی۔ کہ یہ شریر فقیر اپنے چالیسوں ساتھیوں کے ساتھ حُسن بانو کی حویلی پر آپڑا۔ اور سونا اور جواہرات اور تمام مال اسباب لُوٹنے لگا ۔

کھڑکے سے کُچھ نوکروں کی آنکھ کُھل گئی۔ تو وہ ان ڈاکوؤں سے لڑنے لگے۔ لیکن بہتنے تھے۔ زخمی ہوئے۔ اُن کی چیخ پکار سے حُسن بانو بھی جاگ گئی۔ اپنی کوٹھری سے سر نکال کر جھانکا۔ تو صحن میں دیکھا۔ کہ شاہ صاحب اپنے چالیسوں ساتھیوں سمیت مَوجُود ہیں۔ اور لوُٹ مار اور خُون کر رہے ہیں۔ بڑی حیران ہوئی ۔

رات تو پچھتاوے میں کاٹی۔ صُبح کو زخمی اور مُردہ نوکروں کو چارپائی پر ڈالا۔ اور بادشاہ کے محل میں پہنچی۔ فریادیوں کی طرح

ہوئی۔ اور دُہائی دے کر کہنے لگی۔" میں لُٹ گئی "۔

(۵)

بادشاہ نے پاس بُلایا۔ اور محبت سے حال پُوچھا۔ حُسن بانو نے سلام کیا۔ سارا قِصّہ سُنایا۔ اور کہا۔" خُدا آپ کے شاہ جی کا مُنہ کالا کرے اُنہوں نے مجھے لُوٹ لیا۔ اور میرے نوکروں کو زخمی کیا اور مار ڈالا ہے "۔

بادشاہ یہ بات سُنتے ہی آگ ہوگیا۔ اور کہنے لگا۔" اے نادان بے وقوف۔ تجھے کچھ عقل بھی ہے۔ جو ایسے فقیر پر اِس طرح کی تُہمت لگائی ہے۔ اُنہیں تو ایسی چیزوں سے نفرت ہے "۔

حُسن بانو نے پھر کہا۔" بادشاہ سلامت، ایسے ظالم کو فقیر نہ کہیئے۔ وہ تو شیطان سے بھی بڑھ چڑھ کر ہے "۔ یہ سُن کر بادشاہ کو اور بھی غصّہ آگیا۔

ہے۔ اُٹھ اور اس خزانے کو کام میں لا"
یہ خواب دیکھتے ہی حُسن بانو چونک پڑی۔
دائی کو جگا کر خواب سُنایا۔ پھر ایک لکڑی لے کر
زمین کھودی۔ تو سات کُوئیں اشرفیوں سے بھرے
ہوئے اور کئی صندوق موتیوں اور جواہرات سے
بھرے ہوئے نکلے۔ یہ دیکھ کر حُسن بانو بڑی
خوش ہوئی۔ اور سجدے میں گر کر خدا کا شکر بجا
لائی۔

اپنی دائی سے کہا۔ "اناں تم شہر کو جاؤ۔ اور
کُنبے کے لوگوں کو اور کھانے پینے کا سامان لے
آؤ۔" دائی نے کہا۔ "بیٹی۔ تجھے اکیلا چھوڑ کر
کیسے چلی جاؤں۔ کہیں تجھ پر کوئی آفت نہ آجائے"
اتنے میں حُسن بانو کا کُتا اسے ڈھونڈتا ڈھونڈتا
وہاں آنکلا۔ اور حُسن بانو کے پیروں میں گر کر
رونے لگا۔ حُسن بانو نے اسے گلے لگا کر خزانہ ملنے

کا سارا حال سُنایا۔ اور کہا "اب گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ تُم شہر میں جاکر میرے نوکروں اور کُنبے کے لوگوں کو لاؤ۔ اور ضروری سامان بھی لیتے آنا۔ پھر اچھّے اچھّے ہوشیار راج مزدُوروں کو لگا کر یہاں ایک شہر بسانے کا انتظام کرو۔ مگر میرا حال کسی کو نہ بتانا"

اس نے یُوں ہی کیا۔ کُنبے کے لوگوں نوکروں اور راج مزدُوروں کو لے کر حُسن بانو کے پاس آیا۔ اور جنگل میں محل بننے کی تیاری ہونے لگی۔

(۷)

چھ مہینے میں راج مزدُوروں نے اس جنگل میں ایک بڑا خوب صُورت محل کھڑا کر دیا۔ اب حُسن بانو نے اُن سے کہا۔ کہ اس محل کے ارد گرد شہر بھی بسا دو۔ راج مزدُوروں نے

کہا۔ کہ بادشاہ سے اجازت لئے بغیر یہاں اتنا بڑا شہر بسانا ٹھیک نہیں ہے۔

یہ سُن کر حُسن بانو نے مردانہ بھیس بنایا۔ عربی گھوڑے پر سوار ہوئی۔ ساتھ بہت سے نوکر لئے۔ اُن کے سر پر اشرفیوں اور جواہرات کے تھال رکھے۔ اور بادشاہ کی خدمت میں روانہ ہوئی۔

محل پر پہنچ کر ملنے کی اجازت مانگی۔ بادشاہ نے اپنے حضور میں بُلوایا۔ حُسن بانو نے بڑے ادب سے سلام کیا۔ نذر کے تھال تخت کے نیچے رکھ دیئے۔ اور چُپکی کھڑی ہوگئی۔ بادشاہ نے پُوچھا "تم کس شہر کے رہنے والے ہو۔ اور کس کام کو آئے ہو؟"

حُسن بانو نے کہا "میں ایک سوداگر کا بیٹا ہُوں۔ میرا نام ماہرو شاہ ہے۔ میرے ابا جان

پچھلے دِنوں اس شہر کے قریب ایک جنگل میں مر گئے ہیں۔ میں چاہتا ہُوں۔ کہ اُن کی یادگار میں وہاں ایک شہر بساؤں۔ اسی کی اجازت لینے آیا ہُوں"۔

مردانہ لباس میں حُسن بانو بڑی خُوب صُورت معلوم ہو رہی تھی۔ بادشاہ کو اس پر بڑا پیار آیا بولا:۔ "تمہارے ابّا جان مر گئے ہیں۔ تو اب مجھے اُن کی جگہ سمجھو۔ شوق سے شہر بساؤ۔ روپیہ پیسہ چاہتے ہو۔ تو مجھ سے لو۔ اور ملنے کو آیا کرو"۔

حُسن بانو شکریہ ادا کر کے رُخصت ہوئی۔ اور اپنے محل میں پہنچ کر شہر آباد کرنے کا حکم دے دیا۔

دو برس میں بڑا خُوب صُورت شہر بن کر تیار ہو گیا۔ اور حُسن بانو نے اس کا نام شاہ آباد رکھّا۔ کاری گروں کو بہت سا انعام دے کر

رُخصت کیا ؏

(۸)

حُسن بانو نے بادشاہ سے مُلاقات تو کر ہی لی تھی۔ اب آنا جانا بھی شروع کر دیا۔ اور خوب دوستی پیدا کر لی۔ ایک روز حُسن بانو بادشاہ سے ملنے گئی۔ تو وہ شاہ صاحب کے ہاں جا رہا تھا۔ بادشاہ نے حُسن بانو کو بھی اپنے ساتھ چلنے کے لئے کہا۔ اس کا جی تو نہ چاہتا تھا۔ مگر بادشاہ کا حکم تھا۔ ساتھ ہو لی ؏

شاہ جی کے ہاں پہنچ کر بادشاہ نے حُسن بانو کی اس سے ملاقات کرائی۔ اور شاہ جی کی تعریفیں کرنے لگا۔ شاہ جی نے بھی حُسن بانو کو مردانہ بھیس میں نہ پہچانا ؏

حُسن بانو نے ہاتھ باندھ کر شاہ جی سے کہا۔ "کبھی میرے غریب خانے پر بھی تشریف

لائیے۔" شاہ جی نے کہا۔ "میں آجاؤں گا۔" اس
پر حُسن بانو نے بادشاہ سے کہا۔ "میرا گھر بہت
دُور ہے۔ اتنی دُور شاہ جی کو آنے کی کیا تکلیف
دُوں۔ میں نے سُنا ہے۔ کہ شہر میں برزخ سوداگر
کی حویلی خالی پڑی ہے۔ اگر چند روز کے لئے
وہ مجھے مل جائے۔ تو وہاں شاہ جی کو بلاؤں۔"
بادشاہ نے کہا "ماہرو شاہ۔ میں نے وہ
حویلی تجھ ہی کو بخشی۔"
حُسن بانو نے بادشاہ کا شکریہ ادا کیا۔ اور
رُخصت ہو کر اپنے محل میں پہنچی۔ پھر نوکروں کو
ساتھ لے کر پُرانی حویلی میں آئی۔ اس کو برباد
دیکھ کر روتی رہی۔ پھر اس کی مُرمت کا حکم دیا۔
مہینے بھر میں مرمّت ہو کر حویلی پھر نئی نکل
آئی۔ اب حُسن بانو نے اپنے شہر سے بہت
قیمتی سامان منگوا کر اس حویلی کو خوب سجایا۔ اور

ضیافت کا انتظام شروع کیا۔ جب سب کچھ ہو چکا۔ تو شاہ جی کو بلاوا بھیجا۔ اور انہوں نے اگلے دن آنے کا وعدہ کیا۔

(۹)

شاہ جی اُسی طرح سونے چاندی کی اینٹوں پر پاؤں رکھتے ہوئے آئے۔ حُسن بانو نے اُن کو بڑی عزت سے بٹھایا۔ طرح طرح کے تحفے پیش کئے۔ مگر شاہ جی نے کچھ نہ لیا۔ حُسن بانو نے سامان طاقوں پر رکھوا دیا۔ کہ شاہ جی کی نظر اسی پر پڑتی رہے۔

پھر بڑے قیمتی برتنوں میں کھانا آیا۔ اور حُسن بانو نے شاہ صاحب سے کھانے کو کہا۔ اُنہوں نے ذرا سا کھا کر ہاتھ بڑھا لیا۔ اور کہا:- "ہم فقیر زیادہ نہیں کھاتے۔ زیادہ کھائیں۔ تو خدا کی عبادت نہ کر سکیں۔" مگر دل ہی دل میں شاہ

جی کہہ رہے تھے۔ بڑی موٹی چڑیا ہاتھ آئی ہے۔ یہ سب مال اسباب اپنا ہی ہے ؛

تھوڑی دیر بعد شاہ جی حُسن بانو کے ہاں سے رُخصت ہوئے۔ اپنے گھر آئے۔ اور ساتھ کے ڈاکوؤں سے کہنے لگے" بات تب ہے۔ اگر کسی طرح آج ہی یہ سب مال اسباب اُڑا لاؤ"۔

(۱۰)

رات ہوئی تو اُن سب نے ڈاکوؤں کے سے کپڑے پہنے اور حُسن بانو کی حویلی کو چلے ؛

ادھر حُسن بانو کو یقین تھا۔ کہ شاہ جی ڈاکہ ڈالے بغیر باز نہ رہیں گے ؛ اُس نے اپنے نوکروں سے کہہ دیا تھا۔ کہ گھر کا سارا اسباب کھُلا پڑا رہنے دینا۔ مگر خود ہوشیار بیٹھے رہنا۔ ایک پل کو غافِل نہ ہونا ؛ ادھر شہر کے کوتوال کو لکھ بھیجا تھا۔ کہ آج رات میرے گھر پر

ڈاکہ پڑنے کی خبر ہے۔ تھوڑے سے سپاہی لے کر آئیے۔ اور گھات لگا کر چھپے رہیے۔ جب حویلی سے کوئی آواز آئے۔ تو فوراً اندر پہنچ جائیے ٭

ادھر سب سامان ٹھیک ہو گیا تھا۔ کہ شاہ جی اپنے ساتھیوں سمیت حویلی پر آ پڑے۔ اور اسباب کے گٹھے باندھنے لگے۔ جوں ہی گٹھے باندھ کر ان ڈاکوؤں نے چلنے کی ٹھہرائی۔ نوکروں نے نکل کر اُن کو گھیر لیا۔ اور مشکیں کس لیں ٭

ادھر کوتوال گھات میں بیٹھا تھا۔ شور غل سُن کر حویلی میں آن پہنچا۔ اور ان سب ڈاکوؤں کو ہتھکڑیاں لگا لیں۔ اور جیل خانے کو لے گیا۔ حُسن بانو نے اپنے نوکروں کو بہت سا انعام دیا۔ اور ٹھنڈے جی سے پاؤں پھیلا کر سو رہی ٭

(۱۱)

صُبح ہوئی۔ تو بادشاہ تخت پر بیٹھا۔ امیر

وزیر اپنی اپنی جگہ کھڑے ہوئے۔ بادشاہ نے پُوچھا۔ "رات شہر میں شور غُل کیسا مچا تھا"؟

ابھی کوئی جواب بھی نہ دینے پایا تھا۔ کہ کوتوال آن پہنچا۔ اور سارا ماجرا سُنایا۔ اتنے میں حُسن بانو بھی اپنے مردانے بھیس میں آگئی۔ اور بادشاہ کو اپنا قِصّہ سُنایا۔ اور کہا۔ "اگر کوتوال وقت پر نہ پہنچتا۔ تو میرا گھر لُٹتا۔ اور میں مارا جاتا"۔

یہ سُن کر بادشاہ نے کوتوال سے کہا۔ "ڈاکوؤں کو ہمارے سامنے لاؤ"۔

ڈاکو سامنے آئے۔ تو بادشاہ اُن کے سردار کو دیکھ کر ہکّا بکّا رہ گیا۔ اور بولا۔ "ہائیں۔ شاہ صاحب"!

کوتوال کو حُکم دِیا۔ ان کی گٹھڑیاں کھولو۔ گٹھڑیاں کھولیں۔ تو ان میں چوری کا مال۔ کمندیں اور پھانسیاں نکلیں۔ اب تو بادشاہ کے غصّے کی

کوئی حد نہ رہی۔ حکم دیا۔ کہ یہ بدمعاش ڈاکو
نیک فقیروں کا بھیس بنا کر لوگوں کو لوٹتا رہا
ہے۔ اِس کو اور اِس کے ساتھیوں کو اسی وقت
سُولی دو۔ کہ پھر کوئی ایسا کام نہ کرے ٭
حُسن بانو جب دیکھا۔ کہ دُشمن مارا گیا۔ تو
کرُسی سے اُٹھی اور ہاتھ باندھ کر کہنے لگی" بادشاہ
سلامت مَیں برزخ سوداگر کی بیٹی حُسن بانو ہُوں
مجھے اسی فقیر نے لُوٹا تھا۔ اور آپ نے مجھے
شہر سے نکلوا دِیا تھا۔ میرا کوئی قصُور نہ تھا۔ اب
بھی آپ اِس فقیر کے گھر کی تلاشی لیں۔ تو اس
میں سے میرے باپ کا مال نکلے گا"۔
بادشاہ نے حُسن بانو کو گلے سے لگا لیا۔
اور کہا " مَیں تُجھ سے بہت شرمندہ ہُوں" پھر
حُکم دیا۔ کہ شاہ جی کا گھر کھودا جائے۔ گھر کھودا
گیا۔ تو اُس میں سے چوری کا سارا مال نکل آیا۔

حُسن بانو نے یہ سب مال بادشاہ کی نذر کر دیا۔ اور بادشاہ کو اپنے ہاں مہمان بُلایا ۔

جس روز بادشاہ کو آنا تھا۔ شاہ آباد خوب سجایا گیا۔ بادشاہ پہنچا۔ تو حُسن بانو نے اس پر سونا اور جواہرات لُٹائے۔ پھر اپنے ساتھ لے کر محل میں پہنچی۔ تحُفے نذر کیئے۔ خزانے کے کُنوئیں دکھائے۔ اور کہا" نوکروں کو حکم دیجیئے۔ کہ ان کنوؤں کا تمام مال اسباب آپ کے خزانے میں لے جائیں"۔

لیکن بادشاہ کے نوکر کُنوئیں پر پہُنچے۔ تو تمام خزانہ سانپ بچھوؤں سے بھر گیا۔ نوکروں نے اس بات کی خبر بادشاہ کو دی۔ بادشاہ نے یہ سُن کر حُسن بانو سے کہا۔" اللہ میاں نے یہ خزانہ تیری قِسمت میں لِکھا ہے۔ اسے اور کوئی نہیں لے سکتا ہے"۔

پھر حُسن بانو نے یہ تمام خزانہ خیرات کر دیا۔
سافر خانے بنائے۔ مُسافروں کو کھانا۔ کپڑا۔
قد اور جنس دیتی۔ چند ہی روز میں مُسافروں
نے حُسن بانو کی سخاوت کا چرچا دُور دُور پہنچا دیا"

سچّا ڈاکو

(۱)

بہت عرصہ کی بات ہے۔ رام گڑھ کی ریاست میں شمشیر سنگھ ڈاکو کی بہت دھاک بندھی ہوئی تھی۔ وہ لوگوں کو لوٹتا۔ مکانوں میں نقب لگاتا۔ ایسا ہوشیار اور چالاک تھا۔ کہ سپاہی اور پہرہ دار بیٹھے رہ جاتے۔ اور یہ اپنا کام کر کے صاف نکل جاتا تھا۔

لیکن شمشیر سنگھ اپنی اس زندگی سے کچھ خوش [illegible]تا تھا۔ جانتا تھا۔ کہ ایک نہ ایک دن ضرو[illegible]

ڑا جاؤں گا۔ اور سزا پاؤں گا۔ کئی بار ارادہ
ی کرتا۔ کہ یہ کام چھوڑ دے۔ اور کسی دُوسرے
چھے ذریعے سے روزی کمانے کی کوشش کرے۔
یکن اَور کوئی کام اُس سے ہوتا نہ تھا۔ محنت
مشقت سے روپیہ پیدا کرنے کی عادت نہ
تھی۔ جہاں جیب خالی ہوتی۔ پھر کہیں ڈاکہ
ڈالنے ہی کی سُوجھتی تھی۔

ایک بار وہ جنگل میں سے گزر رہا تھا۔ تو
اُس نے دیکھا۔ کہ ایک سادھو چُپ چاپ
بیٹھا گیان دھیان میں مصروف ہے۔ شمشیر سنگھ
نے دِل میں کہا۔ کہ یہ کوئی پہنچا ہُوا بزرگ ہے۔
آؤ اپنی مشکل اس سے بیان کرو۔ شاید یہ کوئی
اچھا مشورہ دے سکے۔

اس نے سادھو کو سچ سچ اپنا سارا حال
سنا دیا۔ اور پھر پُوچھا "اب آپ بتائیے

مجھے کیا کرنا چاہیے؟"

سادھو اس کی بات سُن کر بہت دیر چُپ رہا۔ پھر بولا "جو کچھ میں کہوں گا کروگے؟"

شمشیر سنگھ نے کہا "لیکن اگر آپ نے کہہ دیا۔ کہ ڈاکے نہ ڈالا کرو۔ تو میں کیا کروں گا؟ میں خود چاہتا ہُوں۔ کہ اس کام سے توبہ کرُوں مگر کیا کروں۔ اَور کوئی کام جانتا نہیں۔ میرے لیئے اس کے سوا چارہ نہیں۔ کہ اسی ذریعے سے اپنا پیٹ پالُوں"

سادھُو نے کہا "اور اگر میں تمہیں ڈاکے ڈالنے سے نہ روکوں۔ تو میری بات مانو گے؟"

شمشیر سنگھ بولا "ہاں۔ آپ اَور جو حکم دیں گے۔ میں ہمیشہ اس پر عمل کروں گا"

سادھو نے کہا "اچھا۔ تو تم صرف اتنا کیجیو۔ کہ جھُوٹ بولنا چھوڑ دو۔ ہمیشہ سچ بولا کرو۔ اگر تو

سے تمہارا بھلا ہوگا"۔

شمشیر سنگھ ذرا دیر چپ رہا۔ پھر بولا "اور میں اَور گُناہ جو کرتا ہُوں۔ اُن کا کچھ ڈر نہیں؟"

سادھو نے کہا "ڈاکہ ڈالنے کی بُری عادت تو تم چھوڑ نہیں سکتے۔ لیکن جھوٹ بولنا سَو گُناہوں کے برابر ایک گُناہ ہے۔ تم کم از کم اپنے دل میں یہ ٹھان لو۔ کہ جھوٹ کبھی نہ بولو گے۔ تمہاری زِندگی اسی ایک خوبی سے سُدھر جائے گی"۔

شمشیر سنگھ نے وعدہ کِیا۔ کہ آئندہ کبھی جھوٹ نہ بولوں گا۔

(۲)

کچھ عرصے کے بعد شمشیر سنگھ کو روپے کی ضرورت پڑی۔ اور اپنی عادت کے مُطابق وہ گھر سے نِکلا۔ کہ کسی امیر شخص کے ہاں ڈاکہ ڈالے۔ اور اُسے لُوٹے۔

رات کے وقت وہ شہر کی گلیوں میں امیروں کے مکانوں کو تاکتا پھر رہا تھا۔ اور سوچ رہا تھا۔ کہ آج ان میں سے کس کو لُوٹوں۔ کہ ایک اجنبی شخص نے ایک اندھیری گلی سے نکل کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ شمشیر سنگھ نے مُڑکر اُس کی طرف دیکھا۔ تو وہ بولا" تم کون ہو۔ اور رات کے وقت گلیوں میں پریشان کیوں پھر رہے ہو؟"

ڈاکو نے سچ بولنے کا وعدہ کر رکھا تھا۔ بولا" میں شمشیر سنگھ ڈاکو ہُوں۔ اور یہ دیکھتا پھر رہا ہوں۔ کہ آج کس شخص کے ہاں ڈاکہ ڈال کر اُسے لُوٹوں"

اجنبی ڈاکو کی سچائی پر حیران سا رہ گیا۔ پھر بولا" امیروں کے ہاں ڈاکہ ڈال کر کیا کروگے۔ راجہ کے محل کو چلو۔ امیر تو لُٹ کر برباد ہو جائیں گے۔ راجہ کے پاس اتنا ہے

کہ لُٹ گیا۔ جب بھی اُس کے بہت سے خزانے بھرپُور رہیں گے"۔

شمشیر سنگھ بولا۔" کہتے تو سچ ہو"۔

اجنبی نے کہا۔" اور مجھے راجہ کے محل کا سب حال بھی معلوم ہے۔ اگر تم میرے ساتھ چلو۔ اور جہاں میں کہوں۔ وہاں نقب لگاؤ۔ تو بڑی خاموشی اور بڑی آسانی سے اپنا کام کر جاؤ گے۔ اور کسی کو کانوں خبر بھی نہ ہونے پائے گی"۔

شمشیر سنگھ نے پُوچھا۔" اور یُوں میری مدد کرنے کا بدلہ تم کیا لو گے"؟

اجنبی نے کہا۔" جو کچھ لُوٹو۔ آدھا تم لے لینا۔ آدھا مجھے دے ڈالنا"۔

شمشیر سنگھ بولا۔" مجھے منظور ہے"۔

چنانچہ دونوں گلیوں سے بازار میں آ گئے

اور تیز تیز قدم اُٹھاتے راجہ کے محل کو روانہ ہو گئے۔

(۳)

راجہ کے محل پر پہنچ کر اجنبی ڈاکو ایک الگ تھلگ اور اندھیری جگہ لے گیا۔ وہاں ایک دیوار کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ "اگر تم یہاں نقب لگاؤ۔ تو اندر دو کمروں میں سے ہو کر سیدھے راجہ کی خواب گاہ میں پہنچ جاؤ گے۔ راجہ اپنے بعض ہیرے اپنی خواب گاہ ہی میں رکھتا ہے ان میں سے جتنے ہیرے تم چاہو چُرا سکتے ہو"۔

شمشیر سنگھ کو نقب لگانے کے لئے وہ جگہ بہت پسند آئی۔ نقب لگانے کا سامان اپنے کپڑوں میں چھپا رکھا تھا۔ اُسے نکال نقب لگانے میں مصروف ہو گیا۔ اپنے

کام میں ہوشیار تو تھا ہی۔ ذرا سی دیر میں دیوار کی اتنی اینٹیں نکال ڈالیں۔ کہ اندر گھسنے کے لئے بڑا کافی راستہ بن گیا۔

شمشیر سنگھ نے اجنبی سے پُوچھا" تم میرے ساتھ اندر چلو گے؟"

اجنبی نے کہا "جیسے کہو۔ تمہیں میرا ساتھ چلنا پسند ہو۔ تو اندر چلنے کو تیار ہُوں۔ یہ پسند ہو۔ کہ باہر ٹھہر کر پہرہ دُوں۔ تو یہاں ٹھہرا جاتا ہُوں"۔

شمشیر سنگھ نے کچھ سوچ کر اجنبی کو باہر ہی ٹھہرنے کے لئے کہا۔ اور خود محل کے اندر گھُس گیا۔

اندر دو کمروں میں سے گذر کر تیسرے میں قدم رکھا۔ تو دیکھا کہ وہ راجہ کی خواب گاہ ہے فانوس کی مدھم روشنی میں سجا سجایا کمرا خالی پڑا

تھا۔ راجہ بستر پر موجود نہ تھا۔ شمشیر سنگھ نے اس موقعے کو غنیمت سمجھا۔ اور جلدی سے بڑھ کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ کہ راجہ کے ہیرے کہاں رکھے ہوئے ہیں۔

راجہ کے چھپر کھٹ کی طرف نظر اُٹھائی۔ تو ادھر دیوار میں ایک طاق نظر پڑا۔ جس میں ایک صندوقچی رکھی ہوئی تھی۔ شمشیر سنگھ لپک کر طاق کے پاس پہنچا۔ اور صندوقچی نکال لی۔ اسے کھول کر دیکھا۔ تو اس میں تین بے حد قیمتی ہیرے جگ مگ جگ مگ کر رہے تھے۔

شمشیر سنگھ چاہتا تھا۔ کہ ہاتھ بڑھا کر تینوں ہیرے صندوقچی میں سے نکال لے۔ کہ اچانک اُسے خیال آیا۔ اگر تین ہیرے چرائے۔ تو انہیں اپنے ساتھی کے ساتھ بانٹوں گا کیونکہ یا تو مجھے جھوٹ بولنا اور یہ کہنا پڑے گا۔ کہ میں

نے دو ہیرے لئے ہیں۔ اور یا سچ بول کر تیسرے ہیرے کے لئے اپنے ساتھی سے لڑائی کرنی پڑے گی۔ اس جھگڑے سے بچنے کی اچھی ترکیب یہ ہے۔ کہ میں دو ہیرے ہی لوں۔ تاکہ ہم دونوں ایک ایک ہیرا آرام سے بانٹ لیں۔ اور کسی قسم کی بدمزگی نہ ہونے پائے ؛

یہ سوچ کر اُس نے صندوقچی میں سے دو ہیرے لے لئے۔ تیسرا پڑا رہنے دیا۔ صندوقچی کو طاق میں رکھ جس راستے آیا تھا۔ اُسی راستے باہر نکل گیا ؛

باہر اجنبی اس کا منتظر کھڑا تھا۔ اُس نے دیکھتے ہی پُوچھا۔ "سُناؤ کیا ہاتھ آیا"؟

شمشیر سنگھ نے سچ سچ ساری بات سُنادی اور کہا۔ "آپس میں جھگڑا پڑنے کے خیال سے تیسرا ہیرا میں صندوقچی ہی میں چھوڑ آیا ہوں۔"

دو ہیرے میرے پاس ہیں۔ ان میں سے ایک تُمہارا ہے۔ ایک میرا۔ جو پسند ہو لے لو۔ زیادہ اطمینان کرنا چاہو۔ تو میری "تلاشی لے کر دیکھ لو کہ اَور کوئی ہیرا میرے پاس موجود نہیں ہے"۔

اجنبی نے کہا "نہیں تم سچے آدمی معلوم ہوتے ہو۔ مجُھے تمہاری زبان پر اعتبار ہے۔ مَیں تمہاری "تلاشی لینے کی ضرورت نہیں سمجھتا"۔ یہ کہہ کر اُس نے شمشیر سنگھ کی ہتھیلی میں سے ایک ہیرا اُٹھا لیا۔ اور اپنی جیب میں ڈال لیا۔ اس کے بعد ڈاکو سے پُوچھا "تم رہتے کہاں ہو؟" شمشیر سنگھ نے سچ سچ اُسے اپنا پتہ بتا دیا۔ اس کے بعد دونوں ہاتھ ملا اپنے اپنے راستے چل کھڑے ہوئے۔

(۴)

اگلے دن ابھی سُورج پورے طور پر نکلا بھی

تھا۔ کہ راجہ کے محل میں نقب لگنے کی خبر ہر طرف مشہور ہو گئی۔ خود راجہ کو یہ خبر پہنچی۔ تو اُس نے فوراً محل کے خزانچی کو طلب کیا۔ اور حکم دیا۔ کہ فوراً سارے محل کی چیزوں کی پڑتال کرو۔ اور دیکھو کہ کیا کیا چیز غائب ہوئی ہے۔ سب سے پہلے قیمتی چیزوں کو دیکھ کر آؤ۔ کچھ ہیرے میری خواب گاہ کے طاق میں صندوقچے کے اندر رکھے تھے۔ انہیں دیکھو۔ کہ کہیں وہ تو چوری نہیں چلے گئے ۔

خزانچی اسی وقت خواب گاہ میں گیا۔ اور وہاں طاق میں سے صندوقچی نکال کر دیکھی۔ اس میں ایک ہی ہیرا پڑا تھا۔ خزانچی کے دل میں بے ایمانی آئی۔ اُس نے سوچا۔ یہ ہیرا میں خود اُڑا لوں۔ اور راجہ سے کہہ دوں گا کہ سب ہیرے چوری چلے گئے۔ راجہ کو پتہ لگنے نہ پائے گا۔

اپنے وارے نیارے ہو جائیں گے ۔

یہ سوچ کر اُس نے ہیرا تو اپنی پگڑی میں چُھپا لیا۔ اور خالی صندُوقچہ لے کر ہانپتا کانپتا راجہ کے حضُور میں پہنچا۔ اور گھبرایا ہُوا بولا "حضُور غضب ہو گیا۔ سب ہیرے چوری چلے گئے۔ صندوقچی دیکھ لیجیئے۔ اس میں ایک ہیرا بھی نہیں۔ ڈاکو صندُوقچی خالی کر گیا ۔

راجہ نے صندُوقچی خزانچی کے ہاتھ سے لے لی۔ اور اسے اپنے پاس بٹھا لیا۔ اور کہا "گھبراؤ مت۔ ہیرے مل جائیں گے۔ جانتے کہاں ہیں اور اگر کھوئے بھی گئے۔ تو کیا ہُوا۔ مَیں مفلس تھوڑا ہی ہو جاؤں گا "۔

راجہ کی یہ بات سُن کر خزانچی کی تسلّی ہو گئی۔ اُس نے سوچا۔ راجہ اب کچھ بھی نہیں کرنے کا۔ ہیرا مَیں نے چھپا رکھا ہے۔ یہ میرا ہو گیا۔

اسی ایک ہیرے کو بیچ کر میں نہال ہو جاؤں گا۔
اُس نے راجہ سے پُوچھا "میں جا کر یہ دیکھوں۔کہ کوئی اَور چیز تو چوری نہیں ہوئی؟"
راجہ نے کہا۔" بیٹھے رہو۔ دیکھ کر کیا کرو گے میں ابھی دربار جا رہا ہُوں۔ میرے ساتھ دربار میں چلو"۔

خزانچی راجہ کے حضور ہی میں بیٹھا رہا۔
تھوڑی دیر بعد راجہ اپنے ضروری کاموں سے فارغ ہو کر محل سے نکلا اور دربار کو چلا۔ خزانچی راجہ کے ساتھ ساتھ تھا۔

(۵)

دربار میں پہنچتے ہی راجہ نے اپنے منتری کے کان میں کچھ کہا۔ جسے سُنتے ہی وہ دربار سے باہر چلا گیا۔ راجہ بڑھ کر سنگھاسن پر بیٹھ گیا۔
درباری رات کے ڈاکے پر افسوس ظاہر

کرنے اور راجہ کو تدبیریں بتانے لگے۔ کہ ڈاکو کا کھوج کس ترکیب سے نکالا جائے۔ راجہ چُپکا بیٹھا سب کی باتیں سُنتا رہا۔ آخر بولا "آپ لوگ فِکر نہ کریں۔ ڈاکُو کا کھوج مَیں خود نکال لُوں گا"

ذرا سی دیر میں منتری باہر سے واپس آیا۔ اور راجہ دربار کے کام میں مشغول ہوگیا + خزانچی چُپ چاپ راجہ کے حکم کے انتظار میں کھڑا رہا +

بہت دیر نہ گذری تھی۔ کہ ایک سپاہی دربار میں آیا۔ اور اُس نے منتری سے کہا۔ کہ جس شخص کو بُلایا گیا تھا وہ حاضر ہوگیا ہے +

منتری نے راجہ کی طرف دیکھا۔ راجہ نے حُکم دِیا۔ اسے دربار میں حاضر کِیا جائے +

ذرا سی دیر میں شمشیر سنگھ ڈاکو دربار میں داخل ہوُا۔ ہاتھ جوڑ کر راجہ کو سلام کِیا۔ اور خاموش کھڑا ہوگیا +

راجہ نے اُس سے پُوچھا۔ "تم کون ہو؟"
شمشیر سنگھ سچ بولنے کا عہد کر چکا تھا۔ بے تکلفی سے بولا "میں شمشیر سنگھ ڈاکو ہُوں"۔
راجہ نے پُوچھا۔ "تم یہاں کیوں آئے ہو؟"
شمشیر سنگھ بولا "منتری جی نے ایک سپاہی میرے گھر بھیج کر مجھ کو بُلوایا ہے"۔
راجہ نے سوال کیا۔ "رات ہمارے ہاں جو ڈاکہ پڑا۔ اس کا حال تمہیں معلوم ہے؟"
شمشیر سنگھ کو ڈر تو تھا۔ کہ راجہ سزا دے گا۔ لیکن اُس نے پھر ہمّت سے کام لیا۔ اور بولا۔ "مجھے معلوم ہے"۔
راجہ نے پُوچھا۔ "وہ ڈاکہ کس نے ڈالا؟"
شمشیر سنگھ ڈرتے ڈرتے بولا "حضور میں نے"۔
ڈاکو کی سچائی پر سارا دربار حیران تھا۔ راجہ

نے اس سے سوال کیا "تم نے ہمارے محل سے کیا چرایا ؟"

شمشیر سنگھ نے کہا۔ "دو ہیرے "

راجہ بولا "لیکن ہماری صندوقچی میں تو تین ہیرے تھے "

شمشیر سنگھ بولا۔ "تیسرا ہیرا میں نے صندوقچی ہی میں چھوڑ دیا تھا "

اب تو خزانچی بہت گھبرایا۔ جھٹ بولا "یہ جھوٹ بکتا ہے حضور۔ تینوں ہیرے اسی نے چرائے ہیں۔ صندوقچی میں ایک ہیرا بھی نہ تھا"

شمشیر سنگھ بولا۔ "اگر مجھے جھوٹ بولنا ہوتا۔ تو میں بھرے دربار میں اس بات کا اقرار بھلا کیوں کرتا۔ کہ میں نے ڈاکہ ڈالا۔ اور دو ہیرے چرائے "

راجہ نے پوچھا۔ "جو ہیرے تم نے چرائے وہ تمہارے پاس ہیں ؟"

شمشیر سنگھ نے جواب دیا۔ "حضور ایک ہیرا میرے پاس گھر پر موجود ہے۔ دوسرا ہیرا میں نے ایک اجنبی کو دے دیا۔ جس نے مجھے محل میں نقب لگانے اور ہیرے چرانے میں مدد دی تھی۔"

خزانچی جھٹ بولا۔ "باتیں سنو ان کی۔ ہیرے اڑانے کے لئے بہانہ بھی کیا بنایا۔ کہ ایک اجنبی کو دے ڈالا ہے۔ جو کچھ کہہ رہے ہو اس کا ثبوت کیا؟"

شمشیر سنگھ۔ "ثبوت میرے پاس کوئی نہیں یا میری بات پر اعتبار کیجئے۔ یا کہیں سے وہ اجنبی ملے۔ تو اس سے پوچھ لیجئے۔"

خزانچی نے کہا۔ "اجنبی ہاتھ آسکتا۔ تو دیکھتا ایسا بہانہ کیوں کر بناتے ہو؟"

اس پر راجہ نے بات کاٹ کر کہا۔ "لیکن ...

وہ اجنبی ہاتھ آسکتا ہے۔ وہ اجنبی مَیں خود تھا"
خزانچی کا مُنہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ سارا دربار
حیرانی سے راجہ کا مُنہ تکنے لگا۔ راجہ بولا "شمشیر سنگھ
نے صرف دو ہیرے محل سے چُرائے تھے۔ اور
اُن میں سے ایک مُجھے دے دیا تھا۔ اس کے
چلے جانے کے بعد مَیں نے محل میں آکر اطمینان
بھی کر لیا تھا۔ کہ صندُوقچی میں ایک ہیرا موجُود ہے
تیسرا ہیرا میرے خزانچی نے چُرایا ہے۔ اسی
وقت اس کی تلاشی لی جائے"
حُکم ملتے ہی ایک سپاہی نے بڑھ کر خزانچی
کی تلاشی لی۔ اور تیسرا ہیرا برآمد کر لیا۔
راجہ بولا "شمشیر سنگھ ڈاکو ہو کر سچ بولتا ہے۔
اور خزانچی میرا نوکر ہو کر مجھ سے جھُوٹ بولتا اور
مُجھے دھوکا دیتا ہے۔ مَیں آج سے خزانچی کو اس
[illegible] سے ہٹاتا اور اس کے بدلے شمشیر سنگھ

ڈاکو کو اپنا خزانچی مقرر کرتا ہوں۔"
شمشیر سنگھ نے بڑھ کر راجہ کے پیروں کو ہاتھ لگایا۔ اور بولا "مجھے ایک سادھو نے نصیحت کی تھی۔ کہ ہمیشہ سچ بولا کر۔ اس سے تیرا بھلا ہو گا۔ آج حضور کے حکم نے سادھو کے کہے کو سچ کر دیا۔ اور میری زندگی سدھار دی۔"
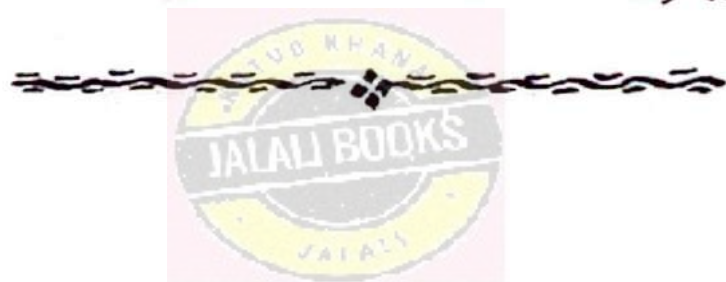
ڈاکو سے مُقابلہ

(۱)

اُس زمانہ میں میری عُمر صرف اُنیس سال تھی۔ ماں باپ کا انتقال ہو چُکا تھا۔ ماموں اچھے خوش حال زمیندار تھے۔ ماں باپ کے بعد اُنہوں نے ہی مجھے پالا پوسا۔ پروان چڑھایا اور تعلیم دِلائی تھی ۔

میرے ماموں کے تعلقات کریم نگر کے تعلقہ دار نواب نوازش علی سے بہت زیادہ تھے۔ میں کاروبار سنبھالنے کے قابل ہو گیا۔ تو میرے

ماموں نے نواب صاحب کو خط لکھا۔ کہ اگر ممکن ہو۔ تو وہ اپنی زمینداری کے کسی مناسب کام پر مجھے ملازم رکھ لیں ؞

اس خط کے جواب میں نواب صاحب نے مجھے مُلاقات کے لئے یاد فرمایا۔ گھر سے روانہ ہوتے وقت میرے ماموں نے مجھے نصیحت کی۔ کہ نواب صاحب اگر تُمہارے لئے ملازمت کی کوئی مُناسب جگہ نکال سکیں۔ تو اپنا کام ایسی محنت اور ایمانداری سے انجام دینا۔ گویا تمہارا اپنا کام ہے ؞

میں نواب صاحب کی خدمت میں پہنچا تو وہ بہت محبّت اور شفقت سے ملے۔ دیر تک میرے ماموں کی باتیں مجھ سے کرتے رہے۔ پھر مجھ سے کہا۔" بھئی۔ تم ہماری اُمّید سے زیادہ کم عُمر نکلے۔ تمہاری عُمر ہمیں ابھی

نظر نہیں آتی۔ کہ کوئی بڑی ذمہ داری کا کام تمہارے سپرد کر دیں۔ بہتر یہ ہو گا۔ کہ کچھ عرصہ تم ہماری زمینداری کے کارندوں کے ساتھ کام کرتے رہو۔ جب تمہیں کچھ تجربہ ہو جائے گا۔ اور ہم بھی یہ اطمینان حاصل کر لیں گے۔ کہ تم ذمہ داری کے کام بخوبی سنبھال سکتے ہو۔ تو تمہاری معقول تنخواہ مقرر کر دیں گے۔ فی الحال ہم تمہیں بیس روپے ماہوار دیں گے۔ اس تنخواہ کے ساتھ رہنے کے لئے جگہ ملے گی۔ اور کھانا تمہیں ہمارے ہاں سے ملتا رہے گا"۔

مجھے نواب صاحب کی یہ شرائط بہت معقول نظر آئیں۔ میں نے اُن کا شکریہ ادا کیا۔ اور ملازمت قبول کر لی۔

اوّل دن ہی سے میں نے اپنا کام بے حد شوق، ایمانداری اور محنت سے کرنا شروع کیا۔

جو باتیں معلوم نہ تھیں۔ اُنہیں بڑی توجہ سے سُنتا
اور یاد رکھتا۔ کبھی کسی کام سے جی نہ چُراتا۔ جو حکم
ملتا۔ فی الفور اُس کی تعمیل کرتا۔ اور ہر ایک سے
محبّت اور اخلاق سے پیش آتا تھا۔ نواب صاحب
اپنے ملازموں کے حالات سے باخبر رہتے تھے۔
خود بھی اپنے ملازموں سے ملتے جُلتے رہتے۔
اور دُوسروں سے بھی اپنے ملازموں کے متعلق
رائے پُوچھتے رہا کرتے۔ اُنھوں نے جو میرا کام
دیکھا۔ اور دُوسروں سے میرے متعلق اچھّی رائے
سُنی۔ تو سال ہی بھر کے عرصے میں اُنہیں مجھ پر
بڑا اعتماد ہوگیا۔ اُنھوں نے میری تنخواہ بھی
دس روپے بڑھا دی۔ اور کام بھی زیادہ ذمّہ داری
کے میرے سپرد کرنے لگے۔

(۲)

مجھے ملازم ہوئے تیسرا سال جا رہا تھا تو

نواب صاحب نے اپنے ایک علاقہ کے مزارعوں
سے روپیہ وصُول کرنے کا کام میرے سپُرد کر دیا۔ یہ
کام بڑی ذمّہ داری کا تھا۔ اسے میرے سپرد
کرنے سے یہ بھی ظاہر تھا۔ کہ نواب صاحب
کو مُجھ پر بہت بھروسہ ہو گیا ہے۔ بھروسہ نہ
ہوتا۔ تو ایسا کام کیوں مجُھ سے لیتے۔ جس میں
بڑی بڑی رقمیں میری معرفت اُن تک پہنچتی
تھیں۔ نواب صاحب کی اِس شفقت سے خوش
ہو کر میَں نے بھی حساب کتاب ایسی خُوبی اور
عُمدگی سے رکھّا۔ کہ اس میں کبھی ایک پائی کی
غلطی نہ نکلی۔

جس زمانہ میں میَں نواب صاحب کی زمینداری
میں یہ خدمت سرانجام دے رہا تھا۔ تو آس
پاس کے علاقوں میں بخشو ڈاکو کی شہرت یک لخت
بہت بڑھ گئی۔ یہ شخص ایک سنگین جُرم میں سزا پانے

کے بعد قید میں سے بھاگ نکلا تھا۔ اور اب سرکاری
سپاہیوں سے چھُپ چھُپ کر جنگلوں میں زندگی بسر
کرتا تھا۔ پیٹ بھرنے کی صُورت اُس نے یہ
نکالی۔ کہ ڈاکے ڈالنے شروع کر دِئے ۔
آئے دِن اُس کے ڈاکوں کی خبریں سُننے
میں آتی رہتی تھیں۔ کہ فلاں گاؤں پر جا پڑا۔
اور فلاں زمیندار کو لُوٹ لیا۔ فلاں راستے
میں ایک بارات کو روک لیا۔ اور باراتیوں کا
مال اسباب اُن سے دھروا لیا۔ فلاں مُسافر کو
راستے میں پکڑ کر اس کی جیبیں خالی کرالیں۔
تھا تو اکیلا۔ مگر ریوالور اُس کے پاس تھا۔ جسے
لُوٹنا ہوتا۔ ریوالور کا مُنہ اُس کی طرف کر دیتا۔
اور ریوالور کے گھوڑے پر اُنگلی رکھ کر جو حکم
چاہتا منوا لیتا۔ سرکاری سپاہی اُس کی تلاش
میں تھے۔ اس کو گرفتار کرانے کا انعام دو ہزار

مقرر تھا۔ لیکن بخشو ڈاکہ ڈال کر ایسا چھلاوے کی طرح غائب ہوتا۔ کہ کسی کے ہاتھ نہ آتا تھا ۔

اب تک بخشو ڈاکو نے سب ڈاکے ہمارے برابر کے علاقے میں ڈالے تھے۔ لیکن ہمیں ہر وقت یہ خوف لگا رہتا تھا۔ کہ کہیں یہ ہمارے علاقے میں بھی نہ آن پہنچے۔ اور ہمیں بھی پریشان نہ کر دے ۔

مزارعوں سے روپیہ وصول کرنے کا وقت آیا۔ تو ہمیں بہت زیادہ فکر ہوئی۔ بڑی بڑی رقمیں لے کر جنگلوں میں سے گذرنا پڑتا تھا۔ کسی اکیلی جگہ میں اگر بخشو نے آلیا۔ اور ریوالور دکھا کر رقم رکھ دینے کے لئے کہا۔ تو ہم کیا کریں گے؟

نواب صاحب سے اس اندیشے کا ذکر کیا۔ تو انہوں نے اپنے تمام ایسے کارندوں کو جن کا کام رقمیں وصول کر کے لانا تھا۔ ایک ایک

پستول اور اس میں چلانے کی کئی کئی گولیاں دے دیں۔ اور کہا۔ کہ جب کبھی رقمیں وصول کرنے کے لئے جاؤ۔ احتیاط کے طور پر پستول اور گولیا اپنے پاس رکھو ۔

پستول پاس ہونے سے میرا بڑا اطمینان ہو گیا۔ اب میں بلا تکلف زمینداری پر آتا جاتا۔ اور بہت بے فکری سے بڑی بڑی رقمیں وصول کر لاتا تھا۔ بخشو کے پاس ریوالور ہے تو ہوُا کرے۔ میرے پاس بھی تو پستول ہے۔ میرے ہاتھ میں پستول ہوتے اُسے کیونکر ہمت ہو سکتی ہے۔ کہ مجھے لُوٹ لے۔ جب کبھی خالی وقت ملتا۔ میں پستول چلانے کی مشق کیا کرتا تھا۔ روز بروز میرا حوصلہ بڑھتا چلا جا رہا تھا ۔

(۳)

لیکن افسوس جب پستول سے کام لینے کا

موقع آیا۔ تو میں کچھ بھی نہ کرسکا۔

اس روز میں گاؤں سے ساڑھے تین ہزار کی رقم لے کر شہر میں نواب صاحب کے پاس جا رہا تھا۔ گاؤں سے روانہ ہونے میں مجھے دیر ہوگئی تھی + عصر کا وقت تھا۔ خیال تھا۔ شہر پہنچتے پہنچتے رات پڑ جائے گی۔ بڑی رقم لے کر اندھیرے وقت میں جنگلوں سے گذرنا تھا۔ لیکن مجھے کچھ اندیشہ نہ تھا۔ اوّل تو کچھ عرصے سے بخشو کے ڈاکے کی خبر سننے میں نہ آئی تھی۔ اور عام خیال تھا۔ کہ وہ کسی دُوسرے علاقے کو سفر کر گیا۔ دُوسرے میرا گھوڑا بہت تیز رفتار تھا۔ اور تیسرے پستول بھی میرے پاس موجود تھا۔ چنانچہ میں نے رقم کمر میں اچھی طرح باندھ لی۔ اور گھوڑے پر سوار ہو اُسے ایڑ لگائی۔ اور شہر کا رُخ کر لیا۔

راستہ میں کچھ دور تک تو لوگ ملتے رہے۔ کوئی ہل اٹھائے اور بیل لئے زمینوں پر سے گاؤں کو واپس جا رہا تھا۔ کوئی اپنی بھیڑوں بکریوں کے ریوڑ لے کر آ رہا تھا۔ اچھی خاصی چہل پہل تھی۔ لیکن آٹھ دس میل نکل جانے کے بعد ادھر راستہ ویران ہو گیا۔ اُدھر شام کا اندھیرا گہرا ہونے لگا۔ بس اب جنگل میں سے کہیں کہیں پرندوں کے بولنے کی آوازیں آ رہی ہیں اور یا سوکھے پتّوں پر جانوروں کے چلنے کی۔ لیکن مجھے جنگلوں میں گھومنے پھرنے کی عادت پڑ چکی تھی۔ میں بے فکری سے گھوڑا اُڑائے جا رہا تھا۔ اور چاہتا تھا۔ کہ جتنی جلد ہو سکے شہر پہنچ جاؤں۔

جنگل سے باہر نکل کر تھوڑی دور تک میدان تھا۔ اس کے آگے دوسرا جنگل شروع ہو جاتا

تھا۔ میدان اور جنگل میں سے ایک کچّی سڑک گذرتی چلی جا رہی تھی۔ اس پر مَیں نے اپنا گھوڑا ڈال رکھا تھا ۔

مَیں مَیدان سے گذر کر دُوسرے جنگل میں داخل ہونے ہی کو تھا۔ تو سڑک کے کنارے کیا دیکھتا ہُوں۔ کہ ایک سفید سی چیز پڑی ہوئی ہے۔ مَیں نے گھوڑے کی لگام کھینچی۔ اور اُس کی ٹاپوں کی آواز کم ہوئی۔ تو مجُھے کراہنے کی آوازیں بھی آنے لگیں۔ مَیں نے گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے للکار کر پُوچھا۔ "کون ہے"؟

اب مجُھے صاف نظر آ رہا تھا۔ کہ کوئی شخص سڑک کے کنارے بے سُدھ پڑا ہوُا ہے۔ میرے سوال کا اُس نے کوئی جواب نہ دِیا۔ بڑی کمزور آواز میں یُوں کراہتا رہا۔ گویا سِسک سِسک کر دم توڑ رہا ہے ۔

پہلے تو مَیں نے چاہا۔ کہ اسے اس کے حال پر چھوڑ کر اپنی راہ لُوں۔ لیکن پھر دِل نہ مانا۔ ایک مصیبت میں گرفتار انسان کو سنسان جنگل میں مرنے کے لئے اکیلا چھوڑ جانا طبیعت کو گوارا نہ ہُوا۔ مَیں نے دو تین بار اُسے پھر آوازیں دیں۔ لیکن اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ معلوم ہوتا تھا۔ بے ہوش سا پڑا ہے۔ صرف بھاری آواز میں آہستہ آہستہ کراہتا ضرور رہا۔

آخر مجھ سے نہ رہا گیا۔ مَیں گھوڑے سے اُتر آیا۔ اور اس شخص کے پاس پہنچا۔ وہ کروٹ کے بل پڑا ہوُا تھا۔ مَیں نے چاہا کہ اُسے چِت لِٹا کر دیکھوں۔ کہ اُسے کہیں چوٹ آئی ہے۔ یا کوئی اَور تکلیف ہے۔

(۴)

لیکن اُسے ہاتھ لگانے کی دیر تھی۔ کہ وہ جھٹ

اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کا جو ہاتھ نیچے کو تھا۔ وہ اس نے یک لخت میری طرف بڑھا دیا۔ اور گرج کر بولا "خبردار!"

میں نے دیکھا۔ کہ یہ شخص بہت لمبا چوڑا اور مضبوط جوان ہے۔ اور اُس نے ایک ہاتھ میں ریوالور سنبھال رکھا ہے۔

میں سُن سا رہ گیا۔ اور میرا دِل دھک دھک کرنے لگا۔ میں نے اُس سے پُوچھا "تم کون ہو؟"
وہ ہنس کر بولا۔ "مُجھے نہیں جانتے؟ میرا نام بخشو ہے۔"

اب میری سمجھ میں آیا۔ کہ یہ ساری بات کیا تھی۔ بخشو ڈاکو نے کسی ذریعے سے معلوم کر لیا۔ کہ میں ایک بہت بڑی رقم لے کر اس راستے شہر کو جاؤں گا۔ گھوڑے سوار سے مقابلہ کرنا اُسے ٹیڑھا کام معلوم ہوا ہوگا۔ شاید یہ خیال بھی آیا ہو۔

کہ جان لینے سے کیا فائدہ۔ بغیر جان لئے اگر کسی کو لوٹا جا سکتا ہو۔ تو سب سے اچھی بات ہے۔ چنانچہ مجھے گھوڑے سے اُتار کر اپنے قابو میں کرنے کے لئے یہ چال چلا۔ کہ آدھ مُوا سا بن کر سڑک کے کنارے پڑ رہا۔ سوچا۔ کہ اِس حالت میں کسی کو پڑا دیکھ کر یہ گھوڑے سے اُترے گا۔ اور اس کے اُترتے ہی میں اسے قابو میں کر لوں گا۔ یہ مجھے علم نہیں۔ کہ اگر میں گھوڑے سے نہ اُترتا۔ تو وہ کیا کرتا۔ لیکن میں نے تو بالکل وہی بات کی۔ جس کی بخشو کو اُمید تھی۔

میں نے بخشو سے پُوچھا "تم کیا چاہتے ہو؟"

بخشو بولا "جو رقم شہر لے جا رہے ہو۔ سیدھے ہاتھ سے میرے حوالے کر دو۔"

میں نے کہا "اور اگر میں نہ دُوں۔ تب؟"

بخشو ہنس پڑا۔ "مجھ سے کیوں پوچھتے ہو۔ کہ تب کیا ہوگا۔ یہ ریوالور دیکھ لو اور سمجھ جاؤ۔ ذرا سی دیر میں تمہاری لاش یہاں تڑپتی ہوئی نظر آئے گی"۔

میرا پستول میری جیب میں تھا۔ لیکن بخشو کے ریوالور کی نالی کا رُخ میرے سینے کی طرف تھا۔ اتنی مہلت کہاں تھی۔ کہ میں جیب میں ہاتھ ڈال کر اپنا پستول نکال لوں۔ کوشش کرنے میں یہ ڈر بھی تھا۔ کہ بخشو کو معلوم ہو جائے گا میری جیب میں پستول موجود ہے۔ روپیہ رکھوانے سے پہلے وہ میرا پستول جیب سے نکلوا لے گا۔

میں عجب کشمکش و پیچ میں تھا۔ کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ کہ کیا کروں۔ روپیہ بچانے کی کوئی صورت نہ تھی۔ مقابلہ کرنے کا نتیجہ اس کے سوا اَور کچھ نظر نہ آتا تھا۔ کہ بخشو گولی چلا دے گا۔ جس سے

یا مَیں مر جاؤں گا۔ یا زخمی ہو جاؤں گا۔ روپیہ ہر حالت میں اسی کا تھا۔

بخشو للکار کر بولا "نکالتا ہے روپیہ یا مَیں آپ نکالوں"۔

مَیں نے سوچا۔ روپیہ خاموشی سے دے ڈالنا بہتر ہے۔ اسے زبردستی پر مجبور کرنے سے آخر کیا حاصل؟ چنانچہ رقم نکالی۔ اور ساری کی ساری ڈاکو کے سامنے رکھ دی۔

بخشو نے رقم سمیٹ کر اپنی جیب میں ڈال لی۔ پھر بولا "جیتے رہو۔ آدمی سمجھ دار ہو۔ بغیر دنگے فساد کے بات مان گئے۔ اور رقم دے ڈالی۔ بس اب بھاگ جاؤ اور ہوا کھاؤ"۔

مَیں اُٹھ کھڑا ہُوا۔ اور اپنے گھوڑے کی طرف بڑھا۔ بخشو ڈاکو بولا "گھوڑا رہنے دو۔ یہ ہمارے کام آئے گا۔ چہل قدمی کرتے جاؤ"۔

مَیں نے مُڑ کر بخشو کو دیکھا۔ ریوالور اُس کے ہاتھ میں تھا۔ اس کے سوا چارہ نہ تھا۔ کہ مَیں گھوڑے کے قریب سے ہٹ آؤں۔ اور پیدل وہاں سے شہر کو روانہ ہو جاؤں ۔

(۵)

چند قدم چل کر مَیں رُک گیا۔ اور مَیں نے مُڑ کر بخشو سے کہا۔ "یہ رقم چھین کر تُم نے مجھ پر بڑا ظلم کیا ہے۔ یہ رقم میری نہیں۔ میرے آقا نواب صاحب کی ہے۔ اُنہیں جب معلوم ہو گا۔ کہ اتنی بڑی رقم مَیں نے گنوا دی۔ تو وہ مجھے نوکری سے الگ کر دیں گے۔ مَیں کوڑی کوڑی کو مُحتاج ہو جاؤں گا"۔

بخشو قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ اور بولا۔ "یہ تو بہت ہی اچھا ہو گا۔ پھر تم بھی میری طرح ڈاکے مارنا شروع کر دینا۔ اکیلے کام نہ چلے۔ تو مُجھ سے

آ ملنا۔ خُوب گُذرے گی جو مِل بیٹھیں گے دیوانے دو"۔

یہ کہہ ریوالور میری طرف کیئے وہ میرے گھوڑے کی طرف بڑھا۔ مَیں نے دیکھ لیا۔ کہ اس شخص کو اپنے اوپر رحم نہیں دِلایا جا سکتا۔ یہ بڑا سخت دِل آدمی ہے۔ اَور کوئی بات کرنا بے کار ہے۔ چنانچہ اپنی راہ لگ لیا۔

لیکن چند ہی قدم چل کر یک لخت مجھے ایک ترکیب سُوجھی۔ شاید اس سے میرا کام بن جائے۔ میرا دِل دھک دھک کرنے لگا۔

مَیں پھر مُڑا۔ اور ڈاکُو کے قریب گیا۔ ریوالور ابھی تک ڈاکو کے ہاتھ میں تھا۔ مُجھے اپنے قریب آتے دیکھ کر وہ بولا "کیوں کیا ارادہ ہے؟"

مَیں نے کہا "بخشو ڈاکو۔ تمہیں روپیہ لینا

تھا۔ وہ تم نے لے لیا۔ اب تم یہ تو نہیں چاہتے کہ مجھے نوکری سے بھی الگ کرا دو"؟

بخشو بولا "تجھے نوکری سے الگ کرا کے مجھے کیا مل جائے گا"؟

مَیں بولا "تو پھر ایسی تدبیر کیوں نہیں کرتے کہ روپیہ کھو بیٹھنے پر مَیں نوکری سے الگ نہ کیا جاؤں"؟

بخشو نے پوچھا "اس کے لئے مَیں کیا کروں"؟

مَیں نے کہا "مَیں جب واپس پہنچ کر اپنے آقا نواب صاحب سے کہوں گا۔ کہ راستے میں بخشو ڈاکو نے مجھے لوٹ لیا۔ تو وہ میری بات پر یقین نہ کریں گے سمجھیں گے۔ کہ روپیہ مَیں نے آپ اُڑا لیا ہے۔ اور بہانہ یہ بنا دیا۔ کہ ڈاکو نے راستے میں لوٹ لیا۔ اس لئے تم اتنی مہربانی کرو۔ کہ میری ٹوپی پر اپنے ریوالور

سے چار پانچ فیر کر دو۔ جب میرے آقا مجھے جھٹلائیں گے۔ تو میں اپنی ٹوپی انہیں دکھا دوں گا۔ اور کہوں گا۔ کہ دیکھ لیجئے میری ٹوپی۔ گولیوں سے چھلنی ہو گئی ہے۔ جب جان کے لالے پڑ گئے۔ تو مجبوراً رقم میں نے ڈاکو کے حوالے کر دی "۔

بخشو ڈاکو میری یہ بات سن کر سوچ میں پڑ گیا۔ میں نے کہا "تمہارا کچھ جانے کا نہیں۔ مجھے فائدہ پہنچ جائے گا۔ تمہیں جو کچھ مجھ سے چھیننا تھا تم چھین چکے۔ اب مجھے برباد کرنے سے تمہیں کیا حاصل ؟"

بخشو میری چال کو نہ سمجھ سکا۔ بولا "کیا یاد کرے گا۔ لا اپنی ٹوپی "۔

میں نے اپنی ٹوپی بخشو کے حوالے کر دی۔ اس نے اسے دوسرے ہاتھ میں پکڑا

کیا۔ اور اس پر ریوالور سے پانچ فیر کر دِئے۔ ٹوپی گولیوں سے چھلنی ہو گئی۔ ٹوپی میرے حوالے کر بخشو نے روانہ ہونے کی ٹھہرائی۔ اور گھوڑے کی طرف بڑھا۔

اس کا گھوڑے کی طرف بڑھنا تھا۔ کہ مَیں نے جھٹ اپنا پستول نکال اس کی نالی کا رُخ بخشو کی طرف کر دیا۔ اور بولا "خبردار۔ ہاتھ اُٹھا لے۔ ورنہ جان سے جائے گا"۔

اب بخشو کیا کرتا۔ اس کا ریوالور گولیوں سے خالی ہو چکا تھا۔ میرے ہاتھ میں بھرا ہُوا پستول تھا۔ اتنی مُہلت اُسے کہاں مل سکتی تھی۔ کہ جیب سے اَور گولیاں نکال کر ریوالور میں بھرے۔

بخشو بولا۔ "یہ اُستادی!"

مَیں نے کہا "حضرت۔ آپ نے بھی اَدھ مُوئا بڈھے کو لُوٹنے کے لئے کچھ کم اُستادی نہ کی

تھی۔ اب میری رقم مجھے واپس دلائیے نہیں بلکہ اپنے پاس ہی رکھیئے۔ اور میرے گھوڑے کے آگے آگے پیدل شہر کو چلیئے۔ مَیں اپنے پستول کی نالی کا رُخ آپ کی پیٹھ پر رکھوں گا۔ بھاگنے کی کوشش کی۔ تو فوراً پستول داغ دُوں گا۔ سمجھے آپ؟ اس لئے کسی حماقت کی کوشش نہ کیجئے گا"

(۶۷)

مَیں نے بخشو ڈاکو کو شہر میں لے جا کر پولیس کے حوالے کر دیا۔ اُس کی گرفتاری کی خبریں تمام بڑے اخباروں میں چھپیں۔ مَیں نے اُسے کس اُستادی سے گرفتار کیا۔ اس کا ذکر بھی اخباروں میں چھپا۔ بعض اخباروں نے اِس بات پر اعتراض تو کیا۔ کہ مَیں نے ڈاکو کو اپنے اُوپر رحم دلا کر اس سے مدد چاہی۔ اور جب اُس نے مدد دے دی۔ تو اُسے قابُو میں کر لیا۔ لیکن

اس کے ساتھ ہی اُنہوں نے یہ بھی لکھا۔ کہ بخشو بے قصُور لوگوں کو اس قدر ستاتا۔ اور ایسی سنگ دلی سے لُوٹتا تھا۔ کہ اس کے یُوں گرفتار ہو جانے پر افسوس نہیں کیا جا سکتا ۔

سرکار کی طرف سے مُجھے دو ہزار روپے کا وہ انعام ملا۔ جو بخشو کو گرفتار کرانے کے لئے مقرّر تھا۔ نواب صاحب نے رقم بچا لینے کی کوشش سے خوش ہو کر میری تنخواہ میں دس روپیہ ماہوار کا اضافہ کر دیا ۔
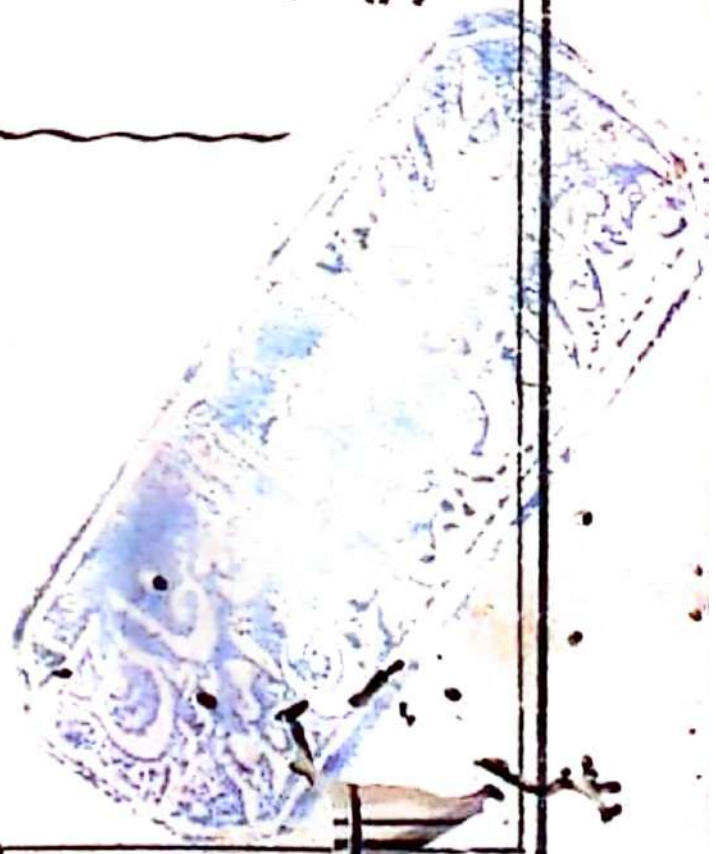
نیک ڈاکو

(۱)

کئی سال ہوئے روہیل کھنڈ کے علاقے میں جبّار ڈاکو کا بڑا شُہرہ تھا۔

جبار ڈاکو اکیلا نہ تھا۔ اس کی ایک بہُت بڑی جماعت بھی تھی۔ اپنی جماعت کے ساتھ یہ بہت گھنے جنگلوں میں رہتا تھا۔ اُس کے تمام ساتھی دلیر اور سمجھ دار لوگ تھے۔ جنگل کے کنارے کنارے بڑی ہوشیاری سے پہرہ دیتے اور خیال رکھتے۔ کہ پولیس کے سپاہی

یا کھوجی تو جبّار کی تلاش میں نہیں آ رہے + جہاں
کوئی ایسا آدمی نظر پڑتا - جس پر شبہ ہو سکتا۔ فوراً
سیٹیاں بجا کر اپنے دُوسرے ساتھیوں کو خبردار
کر دیتے + وہ اندر جنگل میں پہنچ کر جبّار کو اطلاع
پُہنچا دیتے - اور وہ لڑنے مرنے یا وہاں سے
ٹل جانے کے لِئے تیار ہو جاتا تھا ۔

سرکار نے اس بات کا اشتہار دے رکھا
تھا - کہ جبّار کو جو کوئی زندہ یا مُردہ لے کر آئے گا
اسے پانچ ہزار روپے کا انعام دِیا جائے گا +
اس انعام کے لالچ میں کئی پولیس کے سپاہی
اور دُوسرے لوگ ہمیشہ اِس تاک میں رہتے
تھے - کہ موقعہ ملے - تو کسی طرح جبّار کو قابُو میں
لے آئیں - لیکن جبّار خود اتنا چوکنّا رہتا - اور
اُس کے ساتھی ایسی محنت سے اُس کی حفاظت
کرتے تھے - کہ جبّار تک کسی کی پہنچ نہ ہو سکے

پاتی تھی ؀

جبّار میں ایک یہ بڑی خوبی تھی۔ کہ وہ غریبوں اور ضرورت مندوں کی بڑی مدد کرتا تھا۔ جو محتاج کسی طرح اُس تک پہنچ جاتا۔ اور اُس سے کوئی سوال کرتا کبھی خالی ہاتھ واپس نہ آتا تھا۔ جبّار اُس کی اُمّید سے زیادہ اُس کی امداد کر دیتا تھا۔ اُس نے اپنے ساتھیوں کو بھی تاکید کر رکھی تھی۔ کہ جہاں تک ہو سکے غریبوں کے کام آئیں۔ اور اُن کی دُعائیں لیں ؀

جبّار اگر لوٹتا تھا۔ تو بہت امیر لوگوں کو۔ اس میں بھی اس بات کا خیال بہت رکھتا تھا۔ کہ کسی شریف اور سخی امیر کو اُس کے ہاتھ سے تکلیف نہ پہنچنے پائے۔ وہ عام طور پر اُن ہی امیروں پر ڈاکہ ڈالتا تھا۔ جن کے متعلّق مشہور تھا۔ کہ وہ بڑے ظالم ہیں۔ اور غریبوں پر ظلم

کر کر کے اپنے خزانے بھر رہے ہیں ۔ اِس قسم کے جس امیر کا سُراغ جبّار کو مل جاتا ۔ خاص طور پر خیال رکھتا ۔ کہ کب موقع ملے ۔ اور کب اس کے ہاں ڈاکہ ڈالے ۔ جب تک اُسے لُوٹ نہ لیتا ۔ اُسے چین نہ پڑتا تھا ۔

چنانچہ ظالم اور سنگ دِل امیر تو جبّار کو کوستے اور اُس کی جان کے دُشمن بن گئے تھے ۔ مگر غریب اسے اپنا ہمدرد اور مددگار سمجھتے ۔ اور ہمیشہ دُعائیں مانگتے تھے ۔ کہ وہ کبھی پولیس کے ہاتھوں میں نہ پڑے ۔ اور غریبوں کی ضرورتیں مدّتوں تک پُوری کرتا رہے ۔

(۲)

روہیل کھنڈ ہی کے ایک گاؤں میں ایک کسان رہتا تھا ۔ جس کا نام بُندو تھا ۔ بُندو بہت ہی غریب شخص تھا ۔ تھوڑی سی زمین تھی ۔ اُس

سے بہ مُشکل اتنی آمدنی ہوتی تھی۔ جس سے اپنا
اور اپنی بیوی اور دو بیٹیوں کا پیٹ بھرتا تھا۔
آدھی عُمر بے چارے کی یُوں گذر گئی۔ کہ کھانے
کو ہے تو تن ڈھانکنے کو نہیں۔ اور تن ڈھانکنے
کا سامان کیا تو کئی وقت کا فاقہ گزر گیا۔
جب تک لڑکیاں کم عُمر کی تھیں۔ کسی نہ کسی
طرح بُندو کی گزر ہوتے چلی جا رہی تھی۔ لیکن جب
لڑکیاں جوان ہوئیں۔ اور اُن کی شادی کا زمانہ
آیا۔ تو فکر کے مارے بُندو بے چارے کی راتوں
کی نیند حرام ہو گئی۔ جوان لڑکیوں کو کب تک
گھر میں بٹھا سکتا تھا۔ لوگوں نے نام دھرنے
شروع کر دئے تھے۔ مگر مشکل یہ تھی۔ کہ بیاہ کرے
تو کیونکر؟ بیاہ شادی پر کچھ نہ کچھ خرچ تو ضرور
ہوتا تھا جسے روٹیوں کے لالے پڑے ہوں۔
وہ اس خرچ کے لئے روپیہ کہاں سے نکالے؟

بے چارے نے ہر جتن کر دیکھا۔ ہمسایوں سے۔ ساہوکاروں سے۔ امیروں سے۔ ہر ایک سے روپیہ قرض مانگا۔ لیکن ایسے کنگال کو کون قرض دیتا ہے۔ روپے کی بجائے ہر ایک نے ٹکا سا جواب دے دیا۔ اور بُندو بے چارہ مایُوس اور نا اُمید ہوکر بیٹھ رہا ٭

بُندو نے سُن رکھا تھا۔ کہ جبّار ڈاکو غریبوں کی بہت مدد کرتا ہے۔ ہر طرف سے مایُوس ہو جانے کے بعد اُسے جبّار کا خیال آیا۔ ایک روز بیوی سے ذکر کیا۔ کہ اَور کہیں سے تو مدد ملنے کی صُورت نہیں بنتی۔ کہے تو جبّار ڈاکو کے پاس جا کر دیکھ لُوں ٭

ڈاکو کا نام سُن کر بیوی بے چاری پریشان ہو گئی۔ اور میاں کو روکنے لگی۔ کہ کیا پتہ ڈاکوؤں کے ہاتھ پڑ کر کیا گذرے۔ جان ہے تو جہان ہے

صبر شکر کر کے بیٹھے رہو۔ اللہ میاں بڑے کارساز ہیں۔ کوئی صورت آپ بنا دیں گے ٭

بُندو کئی دِن تک غور کرتا رہا۔ کہ کیا کرے۔ جانتا تھا۔ کہ صبر شکر کر کے بیٹھے رہنے سے کچھ نہ بنے گا۔ اللہ بھی اُسی کی مدد کرتا ہے۔ جو اپنی بہتری کے لئے خود ہاتھ پاؤں ہلاتا ہے۔ اِس کے سوا اَور کوئی تدبیر اس کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ کہ جبار ڈاکو کی تلاش میں نکلے۔ اور جس طرح بن پڑے۔ اس تک پہنچ کر اپنا دُکھڑا اُس سے بیان کرے ٭

یقین تھا۔ کہ بیوی کبھی اس خیال کو پسند نہ کرے گی۔ اس لئے پھر اس سے مشورہ کرنا بے کار معلوم ہوا۔ ایک روز بیوی سے بہانہ کیا۔ کہ زمین کے ایک ضروری کام پر شہر جانا ہے۔ شاید ایک دو روز وہاں لگ جائیں۔ مجھے واپس آنے میں

دیر ہو۔ تو گھبرا نہ جانا ۔

یہ کہہ کر اُس نے اپنی پھٹی پُرانی پگڑی سر پر رکھی ۔ لٹھ ہاتھ میں لیا ۔ اور اللہ کا نام لے اس جنگل کی طرف روانہ ہو گیا ۔ جس میں جبّار ڈاکو رہتا تھا ۔

(۳)

بُندو زندگی سے تنگ آیا ہُوا تھا ۔ بلا تکلّف جنگلوں میں گُھستا چلا گیا ۔ اُسے نہ ڈاکوؤں کا ڈر تھا ۔ نہ جنگل کے درندوں کا ۔ دِل میں ٹھانے ہوئے تھا ۔ کہ یا جبّار سے ملوں گا ۔ یا اسی کوشش میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھوں گا ۔

اس کی خوش قسمتی کہئے ۔ کہ جنگل میں ابھی بہت دُور نہ گیا تھا ۔ کہ ملاقات ایک لکڑہارے سے ہو گئی ۔ وہ ایک درخت کی لکڑی کاٹنے میں [illegible]ف تھا ۔ بُندو کو دیکھا ۔ تو اُس نے پُوچھا ۔

جنگل میں مُنہ اُٹھائے کدھر چلے جا رہے ہو؟"

بُندو نے سوال کیا "تم کہو تم کون ہو؟"

لکڑہارے نے کہا "نظر نہیں آتا۔ کیا کام کر رہا ہوں؟"

بُندو ذرا دیر چُپ رہا۔ پھر بولا "گھر سے جبّار ڈاکو کی تلاش میں نکلا تھا؟"

لکڑہارے نے پُوچھا "کیوں کیا پانچ ہزار کا انعام لینے کی ٹھانی ہے؟"

بُندو نے جواب دیا "توبہ کرو توبہ۔ مَیں غریب دُکھیارا تو اُن کی مدد کے بھروسے گھر سے نکلا ہوں؟"

لکڑہارا بولا۔ جبّار ڈاکو ایسی آسانی سے مل سکتا۔ تو پانچ ہزار کا انعام کوئی اب تک وصُول نہ کر چُکا ہوتا؟"

بُندو نے [illegible] ر کر کہا۔ بھیّا ملنا آسان ہو

یا مشکل۔ میں تو ملے بغیر گھر لوٹوں گا نہیں"۔

لکڑ ہارا بولا" یوں ہی جنگلوں میں مارا مارا پھرے گا۔ تکلیفیں اُٹھائے گا۔ جبّار ہاتھ نہیں آئے گا"

بُندو نے جواب دیا" ارے بھیّا تُو تکلیفوں سے ڈراتا ہے۔ میں تو یہ ٹھان کر گھر سے نکلا ہوں کہ یا جبّار سے ملوں گا۔ یا جان سے ہاتھ دھو بیٹھوں گا"۔

لکڑ ہارے نے سوال کیا" آخر پتہ تو لگے کہ ایسی سخت ضرورت کیا ہے"؟

بُندو زمین پر بیٹھ گیا۔ اور لکڑ ہارے کو اپنی مُصیبت اور مجبوریوں کی ساری داستان سُنانے لگا۔

بُندو کی داستان کا لکڑ ہارے کے دِل پر اثر ہُوا۔ سُن کر ذرا دیر وہ چُپ رہا۔ پھر مُنہ سے کچھ نہ بولا۔ البتّہ اُنگلیاں مُنہ میں ڈال کر اُس

نے تین بار بہت زور کی سیٹی بجائی۔ بُندو حیرانی
سے اس کا مُنہ تک رہا تھا ٭

ذرا سی دیر میں جنگل میں سے دو شخص باہر
آئے۔ اور آکر لکڑہارے کے قریب کھڑے
ہو گئے ٭ لکڑہارے نے اُن سے کہا "یہ شخص
بڑا مصیبت زدہ معلوم ہوتا ہے۔ سردار سے
ملنے آیا ہے۔ اسے اندر جنگل میں لے جاؤ" ٭

جو دو شخص جنگل میں سے نکلے تھے۔ اُنہوں
نے بُندو کو کھڑا کر کے اس کی تلاشی لی۔ کہ کہیں
اُس نے حملہ کرنے کے لئے کوئی ہتھیار تو نہیں
چھپا رکھا۔ جب ہر طرح اطمینان کر لیا۔ تو ان
میں کا ایک شخص بُندو کے دائیں ہو گیا۔ اور دُوسرا
بائیں۔ اور یُوں بُندو کو درمیان میں لے کر وہ بولے
"چلو!"

(۴)

جُوں جُوں جنگل کے اندر داخل ہوتے گئے وُہ زیادہ گھنا ہوتا چلا گیا۔ ہر طرف اُونچے اُونچے درخت تھے۔ جن کی چوٹیاں نظر نہ آتی تھیں۔ ان کے گھرے سائے نے دن کی اچھی خاصی رات بنا رکھی تھی۔ دُور اوپر پیڑوں پر پرندے غل مچا رہے تھے۔ نیچے سُوکھے پتّے قدموں تلے آ آکر چڑ چڑ بول رہے تھے۔ اس کے سوا اَور کوئی آواز نہ آ رہی تھی۔

راستے میں کہیں دو دو تین تین آدمی بیٹھے نظر آجاتے تھے۔ یہ سب جبّار کے پہرے دار تھے۔ وہ اپنے ان دو ساتھی ڈاکوؤں سے جو بُندو کو لئے جا رہے تھے۔ چند ایک باتیں کر لیتے۔ کوئی بیٹھا حُقّہ پی رہا ہوتا۔ تو بُندو اور اس کے ہمراہی ذرا دیر بیٹھ کر حُقّے کے دو ایک

کش بھی لگا لیتے۔ اس کے بعد اُٹھ کر پھر آگے روانہ ہو جاتے۔

ڈیڑھ دو میل کا فاصلہ طے کرنے کے بعد جنگل کم گنجان ہو چلا۔ اب درخت ایک دُوسرے سے زیادہ فاصلے پر تھے۔ اُوپر اور دُور سامنے نیلا آسمان بھی نظر آنے لگا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں ایک ایسا میدان آگیا۔ جسے ہر طرف سے جنگل نے گھیر رکھا تھا۔ اس میدان میں لکڑی کی بنی ہوئی ایک بہت لمبی بارک تھی۔

ڈاکوؤں نے بُندو کو لے جا کر بارک کے ایک کمرے میں چارپائی پر بٹھا دیا۔ اور جبّار کو اس کے آنے کی اطلاع دینے چلے گئے۔ اطلاع ملتے ہی جبّار نے بُندو کو اپنے کمرے میں بُلوا لیا۔

جبّار کا کمرہ بڑا سادہ تھا۔ اس میں سامان

بہت کم تھا۔ ایک لکڑی کے تخت پر چاندنی بچھی تھی۔ چاندنی پر گاؤ تکیہ لگا تھا۔ تخت پر ایک طرف کو ایک بڑا سا صندوقچہ رکھا تھا۔ جبّار تکیے سے ٹیک لگائے حُقّہ پی رہا اور اپنے ایک ساتھی سے باتیں کر رہا تھا۔

بُندو نے جاتے ہی بہت جُھک کر جبّار کو سلام کیا۔ اور ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔

جبّار نے سلام کا جواب دے کر پُوچھا "کہو میاں۔ کیسے آئے؟"

بُندو بڑی لجاجت سے بولا "حضور بے حد غریب ہُوں۔ بڑی آس لگا کر آیا ہُوں۔ مجُھے نراس نہ لوٹاتا۔"

جبّار نے پُوچھا "کس بات کی آس لگا کر آئے ہو؟"

بُندو نے اپنی مُفلسی اور جوان بیٹیوں کا

حال سُنا کر کہا "حضور کنواری لڑکی اپنے باپ ہی
کی نہیں۔ سب کی بیٹی ہوتی ہے۔ اُس کے لئے
بر ڈھونڈنا اور اُسے بیاہنا جس طرح اُس کے
اپنے باپ کا فرض ہوتا ہے۔ اسی طرح دُوسروں
کا فرض بھی ہوتا ہے۔ وہ دونوں میری بیٹیاں
ہی نہیں۔ آپ کی بھی بیٹیاں ہیں۔ ان پر مہربانی
کیجیئے۔ اور ایسا بندوبست کر دیجئے۔ کہ آپ کی
بخشش سے میں اُن کے فرض سے سُبکدوش
ہو جاؤں"۔

جبّار نے بُندو کو غور کی نظروں سے دیکھتے
ہوئے کہا "اور اگر میں تمہاری مدد نہ کر سکوں۔
تو؟"

بُندو بولا "تو حضور مجھے جان سے مار ڈالنے
کا حکم دے دیجئے۔ جیسی فکر کی زندگی میری گزر
رہی ہے۔ اس سے موت بہت اچھی ہے

میرے بعد اللہ میری لڑکیوں کا مالک ہے۔ اللہ میاں کو اُنہیں زندہ رکھنا ہوگا۔ تو آپ اُن کی بہتری کی کوئی صورت نکال دیں گے"۔

جبار کو بندو پر ترس آگیا۔ بولا "اتنے بے تاب نہ ہو۔ تمہاری کنواری بیٹیاں میری اپنی بیٹیاں ہیں۔ اگر تم ان کا بیاہ کرنے کے لئے روپیہ نہیں رکھتے۔ تو مَیں تمہیں دوں گا۔ فکر نہ کرو۔ آؤ یہاں تخت پر میرے پاس بیٹھ جاؤ"۔

جبار کے مُنہ سے یہ باتیں سُن کر بندو کی خوشی کا کچھ ٹھکانا نہ رہا۔ وہ ذرا دیر تک حیرانی سے جبار کا مُنہ دیکھتا رہا۔ پھر دوڑ کر اُس کے قدموں سے لپٹ گیا۔ جبار نے اُسے اپنے پیروں سے الگ کر کے تخت پر بٹھا لیا۔ پھر پہلو کی طرف جھک کر اپنا صندوقچہ کھولا۔ اور اس میں سے ایک تھیلی نکالی۔ اسے بندو کے

سامنے رکھ دِیا اور بولا "اس میں ہزار روپے کی مُہریں ہیں۔ یہ لے جاؤ۔ اور ان سے اپنی بیٹیوں کے بیاہ کا انتظام کرو"۔

بُندو نے ہزار روپے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھے تھے۔ اسے دونوں لڑکیوں کے بیاہ کے لئے سَو ڈیڑھ سَو روپیہ مل جاتا۔ تو اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتا۔ اپنے سامنے ہزار روپے پڑے دیکھ کر خوشی کے مارے پاگل سا ہو گیا۔ اس کے مُنہ سے بات نہ نِکلتی تھی۔ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ کہ کیا کہے۔ ذرا سی دیر میں بے اختیار ہو کر جبار کے پیروں کو چُومنے لگا۔ خوشی کے مارے اس کے آنسو بہ رہے تھے۔ اور کانپتے ہوئے ہونٹوں سے لگاتار دُعائیں نکل رہی تھیں۔

جبار کے دِل پر بُندو کی اس حالت کا بڑا اثر ہوُا۔ اس نے بُندو کو بمشکل اپنے پیروں سے

الگ کر کے تخت پر بٹھایا۔ اور بولا" تمہاری بیٹیوں
کو میں اپنی بیٹیاں کہہ چکا۔ اور اگر وہ میری بیٹیاں
ہیں۔ تو پھر میرے لئے اُن کی شادی میں شریک
ہونا بھی ضروری ہوگیا۔ تم اُن کے بیاہ کی بات
چیت شروع کر دو۔ جب رشتہ کہیں طے ہو
جائے گا۔ تو اس کی اطلاع اپنے آدمیوں کی
معرفت مجھے مِل جائے گی۔ لڑکیوں کی شادی
کے موقع پر میں ضرور تمہارے ہاں پہنچوں گا۔ اور
اپنی دونوں بیٹیوں کو ایک ایک زیور اپنے ہاتھ
سے پہناؤں گا۔"
بُندو گم سُم بیٹھا تھا۔ جیسے ہوش ہی میں نہ
تھا۔ جبار نے آواز دے کر ایک ڈاکو کو بُلایا۔
اور اس سے کہا" اس شخص کو ہم نے روپیہ دیا
ہے۔ راستے میں کوئی اسے لُوٹ نہ لے۔ اس
لئے تم اس کے ساتھ جاؤ۔ اور اپنی حفاظت میں

سے اس کے گھر پہنچا آؤ"۔

ڈاکو نے بُندو کو کھڑا کیا۔ تو وہ چونکا۔ جبّار کے اشارے پر اُس نے تھیلی اُٹھالی۔ اور خوشی سے بے قابو ہو کر چیخیں مار مار کر رونے اور جبّار کو دُعائیں دینے لگا۔ ڈاکو اُسے اپنے ساتھ کمرے سے باہر لے گیا۔

(۵)

ڈاکو بُندو کو اُس کے گھر پہنچا کر رُخصت ہو گیا۔

بُندو خوشی کے مارے ناچتا ہُوا گھر میں داخل ہوا۔ اشرفیوں کی تھیلی بیوی کے سامنے رکھ کر بولا "جبّار کے پاس جانے سے روکتی تھی۔ یہ دیکھ جبّار کے پاس سے کیا لایا ہوں"۔

بیوی نے اشرفیوں کی تھیلی دیکھی۔ تو مُنہ کھلنے کا کھلا رہ گیا۔ بُندو نے اُسے ساری داستان

سُنائی۔ کہ کس طرح جبّار کے پاس پُہنچا۔ اس سے
کیا باتیں ہوئیں۔ اور کیونکر جبّار نے بے تکلّف
ہزار روپے کی اشرفیاں اس کے حوالے کر دیں۔
ساتھ ہی یہ بھی بتایا۔ کہ اب جبّار ہماری بیٹیوں
کو اپنی بیٹیاں کہہ چُکا ہے۔ اُس کا وعدہ ہے
کہ ان کی شادی کے موقعے پر وہ خود بھی آئے گا۔
اور اپنے ہاتھ سے اُنھیں کوئی زیور پہنائے گا۔"
اب کیا تھا۔ روپیہ ملتے ہی بُندو نے شادی
کے لئے سامان بنوانا شروع کر دیا۔ سارے
گاؤں میں یہ خبر مشہور ہو گئی۔ کہ جبّار نے بُندو کو
نہال کر دیا۔ اور اُس کی بیٹیوں کو اپنی بیٹیاں
بنا لیا ہے۔ روپے والوں کے لئے بَر کی کیا
کمی۔ چاروں طرف سے رشتہ کے پیغام آنے
لگے۔ دِنوں میں رشتہ طے پا گیا۔ ایک اچھے
خوش حال زمیندار کے بیٹوں سے بات ٹھہری۔

بڑے لڑکے سے بڑی لڑکی کی۔ اور چھوٹے
لڑکے سے چھوٹی لڑکی کی۔ ایک ہی تاریخ دونوں
کے بیاہ کی مقرّر ہو گئی ؞
شادی کی تاریخ مقرّر ہونے کے بعد بُندو
کو دن رات میں کئی بار خیال آتا۔ کہ کیا واقعی
جبار شادی کے موقعے پر آئے گا۔ اور اپنی مُنہ
بولی بیٹیوں کو اپنے ہاتھ سے زیور پہنائے گا؟
وہ جبّار کے اس وعدے کا ذِکر بار بار اپنی بیوی
سے کرتا۔ میاں بیوی کی بات چیت کئی بار
لڑکیوں کے کان میں پڑ جاتی۔ وُہ اِس خیال سے
پھولی نہ سماتیں۔ کہ ایک اتنا بڑا اور مشہور ڈاکُو
اُنہیں اپنی بیٹیاں کہتا ہے۔ اور اُن کی شادی
کے موقعہ پر اپنے ہاتھ سے اُنہیں زیور پہنانے
آ رہا ہے ؞ وہ شیخی میں آکر اس بات کا ذکر اپنی
سہیلیوں اور ملنے جُلنے والوں سے کرتیں۔ یہ خیال

اُنہیں ایک پل کو بھی نہ آتا۔ کہ جبّار کی گرفتاری کا انعام پانچ ہزار روپے مقرّر ہے۔ اور اُس کے آنے کی خبر کو عام کرنا اُسے کتنے بڑے خطرے میں ڈال دینا ہے۔

غرض یہ کہ شادی کا دِن آتے آتے یہ اطلاع گاؤں کے بچّے بچّے کی زبان پر تھی۔ کہ اس شادی میں شریک ہونے کے لئے جبّار ڈاکو آرہا ہے۔

(۶)

شادی میں ایک روز باقی تھا۔ تو اچانک پولیس کا ایک افسر بُندو کے ہاں پہنچا۔ اُس نے بُندو سے کہا۔ ہمیں اطّلاع ملی ہے۔ کہ جبّار ڈاکو تُمھاری بیٹیوں کی شادی میں شریک ہونے کے لئے آنے والا ہے۔ ہم اس موقع پر اُسے گرفتار کرنے کو آئے ہیں۔ اس غرض کے لئے میں خود تمہارے گھر میں ٹھہروں گا۔ میرے ساتھ پولیس کے جو دُوسرے

آدمی ہیں۔ وہ سب سادہ کپڑوں میں ہیں۔ یہ
گاؤں میں بکھر جائیں گے۔ تمہارا فرض ہے۔ کہ
ہمارے یہاں آنے کو سب سے پوشیدہ رکھو۔
اور ڈاکو کو گرفتار کرنے میں ہر ممکن مدد ہمیں دو۔
اگر تم نے ہمیں مدد نہ دی۔ اور ڈاکو کو یہاں آنے
سے روکنے کی کوشش کی۔ تو تم خود گرفتار کر لئے
جاؤ گے"۔

یہ سُن کر بندو بیچارے کے پَیروں تلے
کی زمین نکل گئی۔ حیران تھا۔ کہ بیٹھے بٹھائے
یہ کِس مُصیبت کا شکار ہو گیا۔ ایک طرف اپنے
مُحسن اور مددگار کے گرفتار ہونے کا اندیشہ تھا۔ دُوسری
طرف خود اپنے گرفتار ہونے کا دھڑکا۔ لیکن
سرکاری افسر کے سامنے اس غرِیب کسان کی
حیثیّت کیا تھی۔ کہ اُسے روکتا یا اُس سے بحث
کرتا۔ پُوچھنے لگا "میرے لئے حکم کیا ہے؟"

پولیس کے افسر نے کہا ''ایک تو کوئی کوٹھڑی مجھے ٹھہرنے کے لئے دو۔ اور دُوسرے میرے یہاں ٹھہرنے کی خبر کسی کو نہ پہنچنے پائے''۔

باہر کے رُخ ایک چھوٹی سی کوٹھڑی تھی۔ بُندو نے اس کوٹھڑی میں چارپائی ڈال کر پولیس کے افسر کو وہاں ٹھہرا دیا۔ خود دِل میں دُعائیں مانگ رہا تھا۔ کہ یا اللہ جبّار کو میری بیٹیوں کی شادی کی اطلاع ہی نہ ملی ہو۔ اور اگر اطلاع ملی ہو۔ تو وُہ ادھر آنے اور اپنا وعدہ پُورا کرنے کا ارادہ نہ کرے۔ وُہ اگر آ گیا۔ اور میرے گھر میں گرفتار ہؤا۔ تو میرے لئے ڈُوب مرنے کا مقام ہوگا۔

پولیس افسر نے چارپائی سرکا کر کوٹھڑی کے کے دروازے میں کر لی۔ کوٹ اتار کر چارپائی کے سرہانے رکھ لیا۔ ریوالور نکال کر کوٹ کے نیچے چُھپا دیا۔ اور پھر اطمینان سے چارپائی پر بیٹھ کر

بہت غور سے دیکھنے لگا۔ کہ کون کون گھر میں آجا رہا ہے + کوٹھڑی ایسے موقع پر تھی۔ کہ کوئی اُس کی نظر سے بچ کر گھر میں داخل نہ ہو سکتا تھا + جو جو لوگ گھر میں آجا رہے تھے۔ ان کے متعلق اُس نے بُندو سے معلوم کر لیا۔ کہ وہ کون کون ہیں + وہ جانتا تھا۔ کہ جبّار آئے گا۔ تو دُلہنوں کو زیور پہنانے ضرور گھر کے اندر جائے گا۔ اس لئے اب وہ اِس تاک میں بیٹھا ہوُا تھا۔ کہ نیا آدمی کون گھر میں داخل ہوتا ہے ٭

صُبح سے دوپہر اور دوپہر سے سہ پہر کا وقت ہو گیا۔ لیکن جبّار بُندو کے ہاں نہ پہنچا۔ پولیس کا افسر مایُوس ہوُا جا رہا تھا۔ بُندو البتّہ دِل ہی دِل میں خوش تھا۔ اور یہ سوچ کر اپنے آپ کو تسلّی دے رہا تھا۔ کہ غالبًا جبّار کو معلوم نہیں ہونے پایا۔ کہ لڑکیوں کی شادی آج کے دِن

ہو رہی ہے ۔

مغرب سے کچھ پہلے بھانڈوں کی ایک ٹولی بُندو کے ہاں پہنچی۔ اور گھر کے سامنے ایک پیڑ کے نیچے کھیل تماشے کرنے لگی۔ ذرا سی دیر میں ان کے اردگرد تماشائی جمع ہو گئے۔ پولیس کا افسر دن بھر کوٹھڑی میں بیٹھا بیٹھا اُکتا گیا تھا۔ وہ بھی ان بھانڈوں کا تماشہ دیکھنے کے لئے باہر نکل آیا۔ مگر تماشا دیکھنے کے شوق کے ساتھ اسے یہ فکر بھی تھی۔ کہ نظر گھر کے دروازے پر سے نہ ہٹنے پائے۔ چنانچہ وہ کبھی بڑھ کر تماشائیوں تک آجاتا۔ اور کبھی ہٹ کر پھر گھر کے راستے میں آ کھڑا ہوتا ۔

ایک بُڈھے نے اُس کی پریشانی دیکھ کر اُس رُخ سے تماشائیوں کو ہٹا دِیا۔ جدھر پولیس کا افسر کھڑا تھا۔ اور پھر بولا " بابو جی آپ کے بیٹھنے کو

چارپائی باہر نکال دُوں ؟"

یہ کہہ کر اور بغیر جواب سُنے وہ لپکا ہُوا اندر گیا۔ اور ذرا سی دیر میں چارپائی باہر نکال لایا+ اس اُس نے چارپائی باہر ڈالی تو پولیس افسر نے چونک کر پُوچھا:" اور اس پر میرا کوٹ بھی تو رکھا تھا۔ وہ کہاں گیا ؟"

بُڈّھا بولا:" کوٹ بھی تھا۔ کوٹ کے نیچے پستول بھی تھا۔ مَیں نے پستول کوٹ کی جیب میں ڈال کر کوٹ کیل پر لٹکا دِیا ہے ؟"

یہ کہہ کر بُڈّھا بھی تماشہ دیکھنے میں مصروف ہوگیا ۞

(۷)

مغرب کا وقت ہوُا ہی چاہتا تھا۔ بارات کی آمد آمد تھی۔ کہ اچانک گاؤں کے ایک حصّے سے شوروغل اور چیخوں کی آوازیں آنی شروع

ہوئیں۔" ڈاکو! ڈاکو! دوڑو! دوڑو!"

یہ آوازیں آتے ہی سارے تماشائی تتر بتر ہوکر اس طرف کو لپکے جدھر سے آوازیں آرہی تھیں۔ پولیس کے افسر نے بھی کوٹ پہن اور ریوالور ہاتھ میں لے اُدھر ہی کا رُخ کیا۔ پل بھر میں تمام میدان صاف ہوگیا۔ صرف وہ بُڈھا وہاں رہ گیا۔ جس نے پولیس کے افسر کے لئے چارپائی باہر نکالی تھی

بُندو گھبرایا گھبرایا پھر رہا تھا۔ کہ اس بُڈھے نے اچانک بڑھ کر اُس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور بولا "بُندو مجھے پہچانا"؟

بُندو حیران ہوکر اس کا مُنہ دیکھنے لگا۔

بڈھا بولا" غور سے دیکھ۔ میں جبّار ہوں۔ میں اپنا قول پُورا کرنے کے لئے یہاں آپہنچا"۔

بُندو اسے پہچان کر گھبرا گیا۔ پریشانی کے

عالم میں بولا۔" حضور یہاں سے فوراً بھاگ جائیے یہاں پولیس کے لوگ آپ کو پکڑنے کے لئے آئے ہوئے ہیں"۔

جبّار نے کہا۔" مجھے سب معلوم ہے۔ اسی لئے تو میرے ساتھیوں نے ڈاکہ ڈالا ہے۔ کہ پولیس والے اور اَور سب لوگ اُس طرف بھاگیں۔ اور مجھے گھر میں جانے کا موقع مل جائے یہ بھانڈ بھی ایک خاص غرض کے لئے میں نے ہی بھجوائے تھے۔ لیکن اب ضائع کرنے کو ایک پل نہیں۔ تو مجھے فوراً اندر لڑکیوں کے پاس لے چل۔ کہ مَیں اپنے فرض سے سُبک دوش ہو جاؤں"۔

بُندو نے دروازے پر پُکار کر کہا۔" مرد اندر آرہے ہیں۔ دُلہنوں کے پاس جانا ہے۔ پردہ کر لو"۔ یہ کہہ جبّار کو گھر میں لے گیا۔ لڑکیاں

کوٹھڑی میں دُلہن بنی بیٹھی تھیں۔ جبّار نے اندر پہنچ کر اُن کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ پھر صدری کی جیب میں سے دو جھومر نکالے۔ اور اپنے ہاتھ سے لڑکیوں کے سر پر باندھے۔ پھر ایک ایک اشرفی دونوں لڑکیوں کے ہاتھ میں رکھی۔ اُنہیں دُعا دی۔ اور بُندو سے بولا "زیادہ ٹھہرنے کا موقع نہیں۔ مَیں اب چلتا ہُوں"۔

لیکن جبّار نے قدم گھر سے باہر نکالا ہی تھا کہ آواز آئی "خبردار!"

دیکھتا کیا ہے۔ کہ سامنے پولیس کا افسر کھڑا ہے۔ اور اُس نے اپنے ریوالور سے اُس کے سینے کو نشانہ بنا رکھا ہے۔ جبّار چُپ چاپ اس کا مُنہ تکنے لگا۔ پولیس افسر بولا "جبّار ڈاکو تُو ہی ہے؟"

جبّار ذرا دیر چُپ رہا۔ پھر مُسکرا کر بولا "ہُوں

تو میں ہی؟"

پولیس کا افسر ہنس کر بولا "چالاکی تو خوب کی تھی۔ کہ گاؤں میں دُوسری جگہ ڈاکہ ڈلوا کر خود یہاں پہنچنے کی صُورت نکال لی۔ مگر تم نے اُڑائی ہے۔ تو ہم نے بھُون کر کھائی ہے۔ آدھا ہی راستہ گیا تھا۔ کہ مجھے اس چال کا خیال آ گیا۔ اور میں پولیس کے دُوسرے آدمیوں کو اُدھر بھیج کر خود اِدھر بھاگ آیا"

جبار ہنس کر بولا "آپ بڑے سمجھ دار معلوم ہوتے ہیں؟"

پولیس کے افسر نے اُسے ڈانٹ دیا "خاموش مذاق اُڑاتا ہے ہمارا۔ بچّہ جی۔ اب دیکھو۔ تمہیں تمہارے ڈاکوں کی سزا کیسے دِلواتا ہُوں"

جبّار بولا "میں یہاں اپنا ایک قول پُورا کرنے کو آیا ہوں۔ یُوں مجھے گرفتار کرنا شرافت

کی بات نہیں ہے۔ مجھے گرفتار کرنا تھا۔ تو اپنی کسی اُستادی سے یا کھلی لڑائی میں گرفتار کرتے"۔

پولیس افسر بولا۔" ہم شرافت ورافت کچھ نہیں جانتے۔ اور تجھ ایسے بدمعاش ڈاکو سے شرافت برتنے کی آخر ضرورت کیا؟ چلو اب حوالات میں چلو۔ اور پانچ ہزار کا انعام ہمیں دلواؤ"۔

جبّار نے ایک قہقہہ لگایا۔ اور بولا" افسوس کہ یہ ارمان آپ کا پورا نہ ہو سکے گا"۔

پولیس افسر گرج کر بولا۔" پورا نہ ہو سکے گا؟ یعنی میرے ہاتھ میں آنے کے بعد تو مجھے چکمہ دے جائے گا؟ بھلا دیکھوں تو۔ کہ تو کیوں کر میرے ہاتھ سے بچتا ہے۔ تو ہلا اور میں نے ریوالور چلایا"۔

جبار مسکراتا ہوا پولیس افسر کے قریب چلا گیا۔ پولیس افسر نے گھبرا کر ریوالور کا گھوڑا دبانا شروع کیا۔ بہتیرا زور لگایا۔ لیکن اس میں سے ایک گولی نہ چل سکی۔ جبار نے اس کے قریب جا کر ہنستے ہوئے صدری میں سے اپنا پستول نکال لیا۔ اور بولا "جناب۔ آپ کے ریوالور کی گولی نہیں چل سکتی۔ مجھ سے پوچھئے۔ کہ کیوں؟ وہ اس لئے۔ کہ جب میں آپ کے لئے کوٹھڑی سے چارپائی نکالنے گیا تھا۔ تو میں نے بڑی پھرتی سے اس کی تمام گولیاں نکال ڈالی تھیں۔ سمجھے آپ؟ اسی لئے تو میں نے بھانڈ یہاں بھیجے تھے۔ کہ آپ کوٹھڑی سے باہر نکلیں۔ اور میں کسی بہانے سے اندر کوٹھڑی میں پہنچوں۔ اور احتیاطاً آپ کا ریوالور خالی کر ڈالوں۔ آیا خیالِ شریف میں؟ اب اِس ریوالور سے بیکار

نہ کھیلئے۔ اسے مجھے دے ڈالئے۔ اور یہ بتائیے۔ کہ مجھے اس بات کی اجازت ہے۔ کہ آپ کے سر کو اپنی گولی کا نشانہ بنا ڈالوں"؟

سامنے جبّار کا پستول دیکھ کر پولیس کا افسر خوف کے مارے تھر تھر کانپنے لگا۔ اور بولا "بہادر جبّار خدا کے لئے مجھ پر رحم کر"۔

جبّار ہنس پڑا۔ بولا "آپ بڑی جلدی اپنی رائے بدل لیتے ہیں۔ ابھی مجھے بدمعاش کہہ کر پکار رہے تھے۔ اب بہادر کہنے لگے۔ لیکن خیر خوف نہ کیجئے۔ آپ ایسے ڈرپوک دشمن کی جان میں نہ لوں گا"۔

یہ کہہ کر جبّار نے ایک خاص آواز کی سیٹی بجائی۔ اسی وقت ایک طرف سے ایک گھوڑے سوار ڈاکو۔ دوسرا خالی گھوڑا ساتھ بھگاتا ہوا آیا۔ اور بندو کے گھر کے سامنے آکر رک گیا۔

جبار لپک کر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ بُندو اب تک بُت بنا دروازے پر کھڑا یہ تماشا دیکھ رہا تھا۔ جبار نے اس کی طرف مُڑ کر کہا "بندو دوست سلام۔ لڑکیوں کو اپنے مُنہ بولے باپ کی دُعا پہنچا دینا۔ زِندگی ہے تو پھر کبھی ملاقات ہو گی"

یہ کہہ کر دونوں ڈاکوؤں نے گھوڑوں کو ایڑ لگائی۔ اور ذرا سی دیر میں دونوں کے دونوں شام کے دُھندلکے میں غائب ہو گئے۔

بُندو اور پولیس کے افسر حیرانی کے عالم میں اُسے رُخصت ہوتا ہوُا دیکھ رہے تھے۔ کہ اتنے میں بارات کے باجوں کی آوازیں آنی شروع ہو گئیں۔ پولیس افسر فوراً وہاں سے رفو چکر ہو گیا۔ اور بُندو بارات کے استقبال کی تیاری کرنے لگا۔

ایک عرب اور ایک ڈاکُو

(۱)

عرب کے ایک امیر کے پاس ایک خُوبصُورت گھوڑا تھا۔ جس کی خُوبصورتی اور چالاکی دُور دُور تک مشہور تھی۔ جو اُسے دیکھتا۔ بے اختیار چاہتا۔ کہ کاش یہ گھوڑا میرا ہوتا ؁

ایک مرتبہ دہر نامی ایک ڈاکُو نے وہ گھوڑا دیکھ لیا۔ دیکھتے ہی بے تاب ہوگیا۔ ہر گھڑی دِل میں خیال رہنے لگا۔ کہ یہ گھوڑا تو کسی طرح ہاتھ آنا چاہیئے+ آخر ایک روز بھیس بدل کر امیر کے ہاں پہنچا۔ اور بولا "میں اس گھوڑے کی مُنہ مانگی قیمت ادا

کرنے کو تیار ہوں۔ یہ گھوڑا میرے ہاتھ بیچ ڈالو"۔
امیر نے جواب دیا۔"یہ گھوڑا میرے شوق کی
چیز ہے۔ مَیں اسے بیچنا نہیں چاہتا"۔
یوں دھر کا کام نہ چلا۔ تو اُس نے سوچا۔ گھوڑا
کسی طرح اُڑانا چاہیئے۔ امیر بہت ٹھاٹ سے رہتا
تھا۔ اس کے کئی ملازم اور مُحافِظ تھے۔ خود بھی بُہت
طاقت وَر اور دلیر شخص تھا۔ چنانچہ زبردستی سے کام
نکلنے کی اُمید نہ تھی۔ سوچ سوچ کر دھر نے یہ طے
کِیا۔ کہ تدبیر سے کام نکالنا چاہیئے۔

(۲)

اُس نے فقیر کا بھیس بدلا۔ اور جس راستے
سے عرب امیر گھوڑے پر سوار ہو کر گُذرا کرتا تھا۔ وہاں
جا بیٹھا۔ جب امیر اُدھر سے گُذرا۔ تو دھر نے نہایت
کمزور آواز میں اُس سے کہا"حضور مَیں ایک فقیر
ہوں۔ تین دِن سے کھانے کو کچھ نہیں ملا۔ فاقوں

کے مارے بدن میں اتنی سکت نہیں رہی۔ کہ چل پھر کر بھیک مانگوں اور پیٹ کی آگ بجھاؤں۔ آپ میری مدد کیجئے۔ نہیں تو یہیں بھوکا مر جاؤں گا۔"

عرب امیر کو اس کی حالت پر ترس آگیا۔ بولا "آؤ میرے پیچھے گھوڑے پر بیٹھ جاؤ۔ میں تمہیں اپنے ہاں لے چلتا ہوں۔ وہاں جو رُوکھی سُوکھی موجود ہو کھا لینا۔"

دہر نے پھر اسی طرح کمزور آواز میں کہا "حضور مجھ سے تو کھڑا بھی نہیں ہُوا جاتا۔ گھوڑے پر کس طرح سوار ہوں؟"

رحم دِل امیر فوراً گھوڑے سے اُتر آیا۔ اور خود سہارا دے کر ڈاکو کو گھوڑے پر سوار کرا دِیا۔

جُوں ہی دہر گھوڑے پر چڑھا۔ اس نے فوراً اُسے ایڑ لگائی اور چلتا بنا۔ جاتے ہوئے پُکار کر کہہ گیا "میں دہر ڈاکو ہوں۔ میں تمہیں اس گھوڑے

کی مُنہ مانگی قیمت دیتا تھا۔ تم مان جاتے۔ تو گھوڑا یُوں ہاتھ سے کیوں گنواتے"؟

(۳)

عرب نے اُسے خدا کا واسطہ دے کر کہا۔"ذرا گھوڑا تھام لے۔ اور میری ایک بات سُنتا جا"۔ دہر نے گھوڑا ٹھہرا لیا۔ تو عرب بولا"تم نے احسان کے بدلے میں مجھ سے جو فریب کیا ہے۔ اس کا انصاف تو خدا کرے گا۔ لیکن میں ایک بات تم سے بہت عاجزی سے کہتا ہُوں۔ کہ تم اپنے اِس فریب کا ذکر کسی سے نہ کرنا۔ ورنہ اِس قصّے کو سُن کر لوگ غریبوں کی مدد کرنا چھوڑ دیں گے۔ سمجھیں گے کہ وہ بھی تمہاری طرح مکر ہی نہ کر رہے ہوں۔ محتاج مُفت میں خیرات سے محروم رہیں گے اور اُن کی مُصیبت کا گُناہ تمہارے سر ہو گا"۔

نیک دِل امیر کی باتیں ڈاکو کے دِل پر اثر

کر گئیں۔ وہ سُن کر بہت شرمندہ ہُوا۔ گھوڑے سے اُتر گیا۔ لگام اس کے مالک کے ہاتھ میں دے دی۔ اور معافی مانگ کر بولا "تم میرے مکان پر چلو۔ میں ایک ہفتہ تک تمہاری دعوت کروں گا۔ آج سے میں اور تم دونوں جانی دوست ہیں"۔ چنانچہ اس کے بعد وہ عرب امیر اور دہر ڈاکو اخیر دم تک پکے اور سچے دوست بنے رہے ۔

سید حمید علی نے امرت الیکٹرک پریس ریلوے روڈ لاہور میں باہتمام پنڈت دھرم چند بھارگو بی۔ ایس سی چھپوا کر شائع کیا ۔